نیلم کی انگوٹھی

از

ظریف دہلوی

اردو مرکز
گنپت روڈ، لاہور

مطبوعہ
علمی پریس، دہلی

قیمت
تین روپے چار آنے

فہرست

انتساب

میں اپنی اِس حقیر ادبی کاوش کو اپنے بہترین معلمؔ مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم و مغفور کی روحِ پاک سے منسوب کرتا ہوں جن کے الطافِ پیہم نے مجھ ہیچمداں کو اِس قابل بنا دیا کہ چند ٹوٹے پھوٹے جملوں کو بُری بَھلی طرح جوڑ کر یکجا کر سکوں۔ شاید اس طرح میں ممدوح مرحوم و مغفور کی روحِ پاک سے اظہارِ ممنونیت و ادائے سپاس کر سکوں۔

ظریف دہلوی

۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء

پیش لفظ

قاضی عباس حسین صاحب ظریف دہلوی ملک کے اُن نامور مزاح نگاروں
شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے نظم ونثر کے میدان میں اپنے رنگارنگ اور بہاریں
ت سے ایک ایسی دلنواز و دلکشا فردوسِ قلم بنا رکھی ہے جس کی سیر سے
کانِ ادب کی طبیعتیں سیر نہیں ہوتیں. ظریف صاحب کی زندگی کے چالیس برس
ں آڈٹ آفس میں گذرے ہیں جہاں کسی قسم کی دلچسپی و دل بستگی نہ تھی. دن بھر
خانوں کے کام میں غلطیاں نکالنے سے کام تھا۔ مگر بچپن سے طبیعت کی
کچھ ایسی پائی تھی کہ ظرافت اُن کی طبیعت میں داخل ہوگئی حتیٰ کہ وہ اگر سنجیدہ
نہ بھی لکھتے ہیں تو اس میں بھی جگہ جگہ ظرافت کی افشاں ہوتی ہے۔ داستاں
ی کے باب میں بھی اُن کو قدرت نے کچھ ایسی سُوجھ بُوجھ عطا فرمائی ہے کہ یہ چیز
ھی گئی ہے. خاص کر زندگی کے خندہ ریز پہلوؤں پر اُن کی نظریں اِس قدر
ں پڑتی ہیں کہ دِل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اِن پہلوؤں کے اظہار میں جو
ت نکتے وہ پیدا کر لیتے ہیں وہ اُن کا خاص حصہ ہے۔ اِن خوبیوں کو دیکھتے
ئے میں سمجھتا ہوں کہ نامورانِ ادب کے زمرے میں ظریف صاحب کیلئے
علیحدہ جگہ ریزرو ہے۔

مجھے اِس وقت اُن کے مزاحیہ کلام سے بحث نہیں ہے کیونکہ یہ مجموعہ اُن کے سنجیدہ افسانوں کا ہے۔ محض تعارفاً اِتنا اعادہ کر دینا موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ظریفؔ صاحب مزاح نگار شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ اِن کے کلام (نظم) خندہ ریز کا ایک ضخیم مجموعہ "روحِ تبسم" کے عنوان سے حال میں چھپ چُکا ہے۔ دِن بھر کے تھکا دینے والے کاموں سے جب انسان کا دماغ چور ہو جائے اُس وقت یہ اشعار "ٹانک" کا کام دیتے ہیں۔ ہندوستان کی تمام قابلِ ذکر ادبی محفلوں، مجالسِ شعر و انشا اور مشاعروں میں ظریفؔ صاحب کو بہ اصرار مدعو کیا جاتا ہے اور لوگ اُن کی آمد آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ لطفِ بیان، خیال و فکر کی طنزیہ بخیہ گری اور تشبیہہ و محاورے کی نُدرت کے اعتبار سے اُردو زندہ مزاح نویس شعرا میں ظریفؔ صاحب کا اب کوئی قابلِ ذکر حریف نہیں دِکھائی دیتا

نثر کے باب میں ظریفؔ صاحب کی ادبی کاوشیں مختصر افسانوں پر مرکوز ہیں اور بہت مشاق ہیں۔ آپ ۱۹۲۲ء سے کہانیاں لکھ رہے ہیں اور ملک کے نامور مرحوم و موجود رسالوں میں اِن کی کہانیاں طبع ہو کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں سنجیدہ اور مزاحیہ افسانوں اور افسانوی مضامین کا ایک مجموعہ "عروسِ ادب" کے نام سے چھپ چُکا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سنجیدہ اور "لائٹ لٹریچر" کی ذیل میں آنے والے دونوں قسم کے افسانے ہیں۔ "عروس ادب" کی کہانیوں نے ہمارے پڑھنے والوں کو کچھ ایسی چاٹ لگائی کہ ظریفؔ صاحب

کو ایک اور مجموعہ صرف مزاحیہ پندرہ افسانوں کا علیحدہ مرتب کرنا پڑا جو حال ہی میں "خانصاحب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ "عروس ادب" اور "روحِ تبسم" کی طرح یہ کتاب بھی بہت جلد مقبولِ انام ہو جائیگی بلکہ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ اِس مجموعے کے چھپنے تک "خانصاحب" تبرّک ہو جائیں گے۔

ایک عرصے سے لوگ "عروسِ ادب" کو دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اِس کا ایک ایڈیشن تو ۱۹۳۶ء ہی میں قبولِ عام کے دسترخوان پر چٹنی ہو گیا تھا۔ اب لوگ پھر وہی کہانیاں طلب کر رہے تھے۔ ظریف صاحب اگرچہ نہایت ہی غیر ادبی مصروفیت میں (بسبب معاش) مبتلا رہتے ہیں لیکن زبان و انشاء کی خدمت کا چسکا پڑا ہوا بُرا ہوتا ہے۔ اِس لئے ظریف صاحب بھی "عروس ادب" کی دوسری رونمائی کے لئے کوشاں رہے۔ اب انہوں نے یہ مجموعہ "نیلم کی انگوٹھی" کے عنوان سے مرتّب کیا ہے جس میں "عروس ادب" کے نو چیدہ چیدہ افسانے نظرثانی اور جِلا کاری کے بعد شائع کئے ہیں۔ ایک افسانہ "نیلم کی انگوٹھی" اب تک کتابی شکل میں نمودار نہیں ہوا تھا جو اب شامل کر لیا گیا ہے۔ میں نے یہ افسانے بڑی گہری دلچسپی سے پڑھے اور یہ محسوس کیا کہ قصہ گوئی کے نقطۂ نظر سے وہ بہت پُرکار ہیں۔ لطفِ بیان اور خوبیٔ انشا کے کیا کہنے۔ ظریف صاحب ٹھیٹ دِلّی والے ہیں۔ زبان اور تحریر کی خوبی پیدا کرنا تو گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور پلاٹ کے معاملے میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ "الف لیلہ" لکھوانے

کوئی جن اِن کے تابع ہے اور وہ پلاٹ لئے دست بستہ سامنے کھڑا رہتا ہے۔

ظریف صاحب کی شخصیت کا پس منظر اُن کی کہانیوں اور کلام سے از خود
یدا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے ظریف صاحب ٹھیٹ دِلّی والے
اور اِس وجہ سے طبیعت بڑی "چورس" پائی ہے جس کے نتیجے کے طور
ہر بزم۔ ہر محفل اور ہر ادبی جھگھٹے میں اپنی ذکاوتِ گفتار، بذلہ سنجی اور شکر بیانی
ے باعث فوراً بار پا لیتے ہیں اور پھر اُن کو آسانی کے ساتھ جُدا کرنے پر لوگ
نہیں ہوتے۔ یہ شگفتگی و گرویدگی اُن کے ذاتی اخلاق اور دلچسپ و موزوں
بیعت کا ثمر ہے۔ چونکہ دِلّی کے قدیم اشراف سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے
نے شہر کی بہت پچ کرتے ہیں۔ اِس شہر کی ایک تہذیبی تاریخ ہے اور وہ اِس
یخ کے اوراق نئی تانتی کی معلومات کے لئے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اِنکے
مضامین اور کلام کے اکثر حصّوں میں اِس چیز کے نقش آپ کو موتیوں کی
رح بکھرے ہوئے جا بجا ملیں گے۔ دِلّی کی معاشرت، یہاں کی تہذیب
زبان بالخصوص گھر کی نکھری سُتھری اُردو کے جو نمونے آپ کے ہاں
ہیں وہ ہمیں اِس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ یہی وہ اردو ہے جو سارے
دوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ پُر تکلّف بناوٹ اور سجاوٹ والی زبان
ں۔ بلکہ زندگی کے ڈراموں میں کام کرنے والے کرداروں کی اصل۔ حقیقی اور
نکان فطری گفتگو۔ جیسا کردار اُس کی ویسی ہی زبان اور ویسا ہی اُس کا نفسیاتی

منظر۔ اِن افسانوں میں آپ کو یہ خصوص واضح نظر آئیں گے۔ جُزئیات قصہ
کی جان سمجھے جاتے ہیں اور اِن پر ظریف صاحب کی خاص نظر رہتی ہے
انتقام' میں داروغہ جی کیرکٹر ایک مثالی سب انسپکٹر کی مکمل تصویر ہے۔

ظریف صاحب کی تحریر میں لوچ، حُسنِ زبان، انشا اور زبانِ خانہ
ھری سُتھری اُردو کے چند نمونے جو خاص طور پر جاذبِ توجہ ہیں، یہاں
کرتا ہوں۔

" ذرا دیکھنا آج حاجی جی کس شان سے اپنے محلّے میں داخل ہو رہے
ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں۔ دو سپاہی آگے ہیں دو پیچھے۔ ساتھ میں
سپکٹر صاحب اور انگریز سپرنٹنڈنٹ بھی ہے جب محلّے میں کبھی موٹر سے
تے تھے کبھی لینڈو میں سے۔ جہاں دو دو خدمتگار ساتھ رہتے تھے،
ں لوگ اُنہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ جب محلّے کا بچہ بچہ اُنہیں
پ سمجھتا تھا اور محبت کے مارے ٹانگوں سے لپٹا جاتا تھا، جہاں کے جوان
ھے سب ہی ان کو فرشتہ سمجھتے تھے۔ آج کیا ستم ہے کہ زمانہ ایسی پاک
مقدّس ہستی کو اِس شکل میں لا رہا ہے۔ بچے سہمے ہوئے کھڑے تک رہے
۔ آج کوئی ٹانگوں میں نہیں لپٹتا۔ جوان اور بوڑھے انگشت بدنداں ہیں۔ حیران
و کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ راتوں رات یہ کیا ہو گیا؟"

("انتقام")

"کلثوم :- اچھی بھائی صبر کیجیے۔ آپا نسیمہ تو اب آ نہیں سکتیں۔ اُن کے ماں باپ کا جو حال نہ ہو تھوڑا ہے۔ ہمارے گھر میں لے دیکے بس ایک آپ ہی یا میں ہوں۔ آپ بھی اب سے دُور جو بیمار پڑے تھے تو اب تک وہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں چلا ہی جاتا ہے۔ ابّا جان بھی آپ کی طرف سے بہت ہی پریشان رہتے ہیں اور امّاں جان تو دیوانی سی ہو رہی ہیں۔ خدا نہ کرے دشمنوں کے کان بہرے اگر آپ کے دشمنوں کو پھر کچھ ہو گیا تو مجھے خیر جانے دیجئے امّاں جان اور ابّا جان کا کیا حال ہو گا۔ اچھی میرے بھائی جان! بس اب نہ روئیے۔ دل کو سنبھالئے۔"

(کیفر کردار)

"بیوی :- تم مردوے یہی سمجھتے ہو کہ ہم کما کر لاتے ہیں تو بڑا تیر مارتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں کہ ہم عورتیں نہ ہوں تو تم مردوں کی خاک بھی عزت نہ ہو۔ یہ ہمارا ہی جگرا ہے کہ بچّوں کو پالیں پوسیں، گھر میں اندر باہر کا انتظام کریں۔ مہینہ بیس دن کے لئے چلی جاتی ہوں تو گھر اوندھا ہو جاتا ہے منوں کوڑے کا انبار لگ جاتا ہے۔ تم مردوں کو اور تو اور جھاڑو تک تو دینی آتی نہیں۔"

(تائید ایزدی)

مجھے افسوس ہے کہ اپنی حسبِ منشا اس کتاب کے افسانوں کی خوبیاں

گنا نہیں سکتا کیونکہ بدقسمتی سے میں آج کل نہایت ہی عدیم الفرصت ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے معزز ممدوح کی تحریر کی خوبیاں اِس کتاب کے پڑھنے والے خود پالیں گے اور مجھے اِن کے ایک اور مجموعے کے مطالعہ کی مسرت نصیب ہوگی۔"

ظفر قریشی دہلوی (بی۔ اے)

۲۳/جولائی ۱۹۴۷ء

گذارش

میرے خُسر جناب مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم و مغفور بڑی
یت کے بزرگ تھے۔ پُرانے زمانے کے بی اے تھے۔ مرحوم کو
و نمود سے چڑ تھی۔ اِس لئے بہت ہی کم لکھتے تھے۔ مگر جب کبھی لکھا اور جہاں
یں لکھا بس یوں سمجھئے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا۔
پنشن لینے کے بعد دو برس زندہ رہے اور اِس عرصے میں زیادہ تر
ہی رہے۔ اُن کی پنشن کے بعد مجھے اُن کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقعہ
ور اُنھوں نے اِس بیماری کی حالت میں اور اِتنی قلیل مدت میں مجھے بھی مضمون
سی کی چاٹ لگادی۔ اُن کی ذراسی توجہ نے میرے ساتھ دریائی کا کام
ا۔ میرا سب سے پہلا مضمون "ڈوچشم دید واقعات" رسالہ تہذیب نسواں"
ت اکتوبر ۱۹۲۲ء میں چھپا۔ میں نے اس مضمون میں خاصے ثقیل اور موٹے
ٹے الفاظ ٹھونسے تھے۔ مگر جب اپنے استادِ مکرم کی خدمت میں لے گیا تو
سے نے سطریں کی سطریں کاٹ کر رکھدیں اور فرمایا کہ" میاں سیدھے

سادے الفاظ میں بھی مطلب ادا ہو سکتا ہے۔ اس ٹھونس ٹھانس سے کیا فائدہ۔ اس میں تمہیں دقت بھی بہت اٹھانی پڑیگی۔ یاد رکھو زبان وہی ہے جسے بچہ بھی سمجھ لے۔ جو کچھ لکھو ایسی سیدھی سادی زبان میں لکھو کہ بچہ بھی پڑھے تو خوش ہو اور ایک ایک لفظ سمجھ لے۔ تم موٹے موٹے الفاظ لکھوگے۔ مشکل ترکیبیں اور بندشیں لاؤگے تو مضمون کو اُن کا پابند کرنا پڑیگا۔ یوں نہ کیا کرو۔ بلکہ یوں کرو کہ ایک واقعہ ذہن میں آیا۔ اب اُسے اِس طرح لکھو جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہو۔ واقعات ہی ایسے ہونے چاہئیں جو دلچسپ ہوں۔ یاد رکھو مرغن کھانے ہمیشہ تکلیف ہی پہنچاتے ہیں۔ تم اپنے بال بچوں سے اور گھر والو سے کیا اِسی طرح باتیں کیا کرتے ہو جیسا یہ مضمون لکھکر لائے ہو؟"

غرض میرے استادِ مکرم نے مجھے خاصا ڈانٹ دیا اور مضمون پر تو اِس بیدردی سے قلم کی چھری چلاتے رہے کہ میں اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ مگر اِس کاٹ چھانٹ کے بعد جو میں نے اُسی کو دوبارہ لکھا تو خود اپنے دل میں قائل ہو کر رہگیا اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ نفسِ مضمون وہی، واقعات وہی مگر جس دُلہن کو میں چوتھی کے جوڑوں میں توئی "ٹھپہ" اور کرن ٹنکے ہوئے کپڑوں سے لاد کر لے گیا تھا وہ درحقیقت "بی شادی" معلوم ہوتی تھی اور یہ سیدھے سادے ہلکے پھلکے کپڑوں میں جنت کی حور معلوم ہوتی ہے۔

جس مضمون کا اوپر ذکر کیا ہے اُس کی سرخی ہے "دو چشم دید واقعات"

مضمون میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ معمولی سے دو واقعات ہیں. مگر میں اسے اس مجموعے میں کچھ تو بطور تبرّک کے درج کرتا ہوں اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ اب اس میں سوائے واقعات کے اور گنتی کے چند جملوں کے میرا کچھ نہیں.
یوں سمجھئے کہ واقعات میرے بتائے ہوئے ہیں مگر لکھے ہوئے میرے استادِ مرحوم کے ہیں. طرزِ تحریر ملاحظہ فرمایئے.

اب آپ میرے باقی مضامین پڑھئے اور دیکھئے کہ میں اپنے اُستاد کی بتائی ہوئی پگڈنڈی پر چل رہا ہوں یا نہیں ؟

عباس حسین ظریفؔ دہلوی
۲۵ / جولائی ۱۹۴۷ء

انتقام

انتقام

میر حسن علی ذات کے سید تھے نجیب الطرفین. ماں بھی سیدانی باپ بھی سید. مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے سید تھے عقل کام نہیں کرتی. دُنیا کہے گی کہ جلے پھپولے پھوڑ رہے ہیں. اللہ واسطے کا بَیر ہے جو یوں دِل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے. مگر خدا کے بندو! ذرا سوچو تو سہی آنکھوں دیکھی تو نگلی نہیں نگلی جاتی. بھئی صاف بات ہے ہم تو لگی لپٹی رکھنے والے ہیں نہیں. ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ع

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے.

سید تھے تو افعال شریفانہ ہوتے. ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سید کے معنی سردار کے ہیں اور سردار کی تعریف یہ ہے کہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" یعنی قوم کا سردار وہ ہے جو اُس کا خادم ہو خادم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ چلمیں بھرے، بچھونے بچھائے، پاؤں دبائے ارے بھئی ہاتھ پاؤں سے، روپے پیسے سے، رسوخ سے غرض جس طرح سے بھی ہو سکے قوم کی مدد کرے، ہمدردی کرے. اب ذرا اِن میر صاحب کی تعریف بھی سُن لیجئے اللہ ہم تو خیر جلے پھپولے پھوڑ ہی رہے ہیں آپ ہی اگر ہو سکے تو اِن کی بریت کیجئے. مگر خدا کے

لئے آنکھوں پر ٹھیکری نہ رکھ لیجئے گا۔ اچھا تو اگر اجازت ہو تو لگے ہاتھوں جناب کا حُلیہ مبارک بھی بیان کرتا چلوں۔ اچھا تو سنیئے:۔ لمبا چوڑا لحیم شحیم جسم خدا جھوٹ نہ بُلائے چھ فٹ سے کچھ اونچے ہی ہونگے۔ بڑا کلّہ جبڑا۔ بڑی بڑی گھن دار مونچھیں جیسے گلہری کی دُم۔ کان گنہگار ہیں دیکھا تو ہے نہیں مگر سُنتے ہیں کہ جوانی میں دونوں طرف مونچھوں میں نیبو رکھکر چلتے تھے بس اتنا ہی کافی ہے۔ اچھا صاحب یہ تو حُلیہ ہوا۔ آپ محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے تنخواہ کو توجیب خرچ سمجھتے تھے اصل آمدنی آپ کی رشوت تھی۔ کس طرح ملنی چاہیئے کیونکر ملنی چاہیئے اس سے کچھ بحث نہ تھی۔ ملنی چاہیئے اور کسی نہ کسی طرح ضرور ملنی چاہیئے اول تو شیطان کی عنایت و مہربانی سے چوری ڈکیتی کی واردا تیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ ایک آدھ خون بھی ہو جاتا تھا کبھی کبھار ہندو مسلمانوں کی لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور آپس کی مار پیٹ اور سر پھٹول تو عام بات تھی۔ لیکن اگر خدانخواستہ کبھی آٹھ دس روز خالی گذر جاتے تو ہمارے میر صاحب کی دماغی ٹکسال میں مقدمے ڈھل بھی جایا کرتے تھے۔ غرض کبھی ہاتھ تنگ نہ ہونے پاتا اور سدا مونچھوں پر تاؤ دیتے اور عیش کرتے۔

دیکھئے کیسی اندھیری رات ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ شام ہی کو موسلا دھار بڑ چکا ہے۔ اِس لئے گلیوں میں کیچڑ ہو رہی ہے۔ جگہ جگہ پانی کھڑا ہوا ہے۔ آج ٹھنڈ بھی اِس بلا کی ہے کہ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ بھلا ایسی سردی اور کیچڑ پانی میں یہ کون دُبکا دُبکا یا جا رہا ہے۔ اے لو یہ تو اس دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ مگر یہ

چُپ چاپ کھڑا کیا کر رہا ہے۔ اگر گھر والا ہے تو اندر کیوں نہیں جاتا اور فقیر ہے تو صدا کیوں نہیں لگاتا۔ ارے کہیں چور نہ ہو۔ مگر چور اِس ٹوٹے پھوٹے پھونس کے جھونپڑے میں آکر کیا کریگا۔ ذرا سُننا یہ گھر میں سے کیسی آوازیں آرہی ہیں۔

"ہائے اللہ میں کیا کروں۔ ارے اِن ننھے بچّوں کا کیا حشر ہوگا؟

"اماں! ابا کہاں گئے؟"

اِتنے میں اس شخص نے کنڈی کھٹکھٹائی اندر سے آواز آئی۔

"ارے بھئی کون ہے؟"

شخص:۔ بہن ذرا یہاں آجاؤ۔

لڑکی:۔ اے ہے اماں نہ جانا۔ خبر نہیں کون ہے

ماں:۔ بیٹی پوچھ تو سہی کون ہے کہاں سے آیا ہے۔

لڑکی:۔ نہیں بی مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ خدا جانے کون ہے کیوں آیا ہے؟

ماں:۔ ارے بھئی کہاں سے آئے ہو کسے پوچھتے ہو۔

شخص:۔ بہن ڈرو نہیں۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ دروازہ نہ کھولنا مگر پاس آکر ایک بات سُن لو۔

لڑکی:۔ اماں جاؤ تو۔ شاید ابا نے کسی کو بھیجا ہو۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔

یہ دونوں ماں بیٹیاں دروازے کے پاس جاکر کھڑی ہوگئیں اور ماں نے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

شخص :۔ بہن تم مجھے نہیں جانتیں اس لئے کیا بتاؤں کہ کون ہوں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے تمہارے رونے کی آواز سنی تو یہاں ٹھہر گیا۔ تم مجھ سے کچھ خوف نہ کرو مجھے اپنا بھائی سمجھو اور بتاؤ کہ تم پر کیا مصیبت پڑی جو ایسی پریشان ہو۔

ماں :۔ تم فقیر ہو؟

شخص :۔ ہاں سائل ہوں میرے سوال کا جواب دیدو۔

ماں :۔ (روکر) بھائی! میں اپنی بپتا کیا سناؤں مصیبت کی ماری ہوں۔ میرے میاں کلابتون کا کام کرتے تھے۔ دس بارہ آنے روز لاتے تھے۔ چار بچے دو میاں بیوی خیر بُری بھلی طرح گذر ہوئی جاتی تھی۔ اب کوئی برس سوا برس سے بُری صحبت میں پڑ گئے کوکین کھانے لگے۔ اسی میں میرا ہاتھ گلا بھی ننگا ہو گیا۔ مگر خدا کی قسم میں نے سوائے ایک دو دفعہ سمجھانے کے ذرا شکایت نہ کی۔ تم جانو آدمی کے سَو دوست سَو دشمن ہوتے ہیں آج شام کو پڑیا لئے چلے آرہے تھے۔ کسی نے مخبری کر دی۔ سپاہی پکڑ کر لے گیا۔ گھر میں قسم کھانے کو ایک دانہ تک نہیں۔ یہ بڑی لڑکی سمجھدار ہے اِسے تو رونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ مگر اِن چھوٹے بچوں کو کیونکر سمجھاؤں۔ کھانے کے لئے مچل رہے ہیں۔

شخص :۔ بہن رو مُ نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ خدا پر نظر رکھو۔ بچّوں کو دلاسا دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

یہ شخص بازار گیا اور بارہ روٹیاں، ایک روپے کے کباب، آدھ سیر ربڑی، اور

دوّ روپے کی متفرق مٹھائی لیکر جلدی سے پھر اُسی دروازے پر پہنچا اور آواز دی۔

"بہن ذرا یہاں آنا۔"

ماں:۔ (دروازے کے پاس جاکر) ہاں بھئی۔

شخص:۔ بہن یہ لے لو۔ آپ بھی کھاؤ اور بچّوں کو بھی کھلاؤ اور خاطر جمع رکھو۔ تمہارے میاں کل صبح کو گھر آجائیں گے۔

ماں:۔ کیا چیز ہے؟

شخص:۔ تھوڑا سا کھانا ہے۔ تم تامل نہ کرو لے لو۔

ماں:۔ آپ کا نام کیا ہے؟

شخص:۔ تمہیں نام سے کیا مطلب ہے؟

ماں:۔ میں بغیر نام پوچھے نہ لونگی۔

شخص:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) بہن خدا کے لئے مجھے ثواب سے محروم نہ کرو۔

ماں:۔ میرا اللہ آپ کی مہربانی کو دیکھ رہا ہے اور آپ کی باتیں سُن رہا ہے وہ آپکو سو درجے ثواب دیگا مگر اپنا نام بتا دیجئے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ بغیر نام معلوم کئے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں گی۔ میرے اور بچّوں کے دم پر جا ہے جو کچھ گذر جائے۔

شخص:۔ (رو کر) اے اللہ تو دیکھ رہا ہے میں اِس وقت مجبور ہوں۔ اچھا بہن سنو مجھ گنہگار کو عبدالوہاب کہتے ہیں۔

ماں:۔ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟

شخص:۔ جب نام ہی بتا دیا تو یہ بھی سُن لو۔ محلہ انصاریان میں رہتا ہوں۔

ماں:۔ آپ حاجی ہیں؟

شخص:۔ ہاں بہن حج کیا تو ہے اللہ قبول کرے۔

ماں:۔ پچھلے رمضان شریف میں آپ کے وعظ میں مَیں بھی موجود تھی۔ آپ تو میرے باپ کے برابر ہیں گھر میں تشریف لے آئیے۔

حاجی عبدالوہاب رومال میں روٹیاں باندھے اور ٹوکری میں مٹھائی۔ ربڑی اور کباب لئے ہوئے اندر گئے۔ بچے ایک غیر شخص کو گھر میں دیکھکر سہم گئے مگر حاجی صاحب نے سب کو چمکارا اور پیار کیا۔ دو چھوٹے بچوں کو اپنے زانو پر بٹھا لیا۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ یہ رونا کیسا تھا یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مگر خیر اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ سچی خوشی جب انسان کو حاصل ہوتی ہے تو اُس کا اظہار آنسو آنکھ سے ٹپک ٹپک کر کرتے ہیں۔ اب آپ کو یہ بتاؤں کہ سچی خوشی کسے کہتے ہیں۔ اچھا خیر سُنیے:۔

اچھے اچھے کھانے کھانے سے، عمدہ سے عمدہ پھل اور میوے کھانے سے اعلیٰ درجے کے حلوے اور مٹھائیاں کھانے سے، اچھے سے اچھے کپڑے پہننے سے جی خوش ضرور ہوتا ہے مگر سچی خوشی ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔ اب رہیں مکروہات اور وہ باتیں جو گناہ میں داخل ہیں مثلاً شراب نوشی، رنڈی بازی وغیرہ۔ توبہ توبہ اِن میں سچی

...ی کہاں دھری ہے. اِن میں تھوڑی دیر کا سرور یا حظ سمجھ لیجیے. پھر ہوش آنے ...پے تو ضمیر ایسی ملامت کرتا ہے کہ دِل ڈر کے مارے سُکڑ کر ایک کونے میں ہو جاتا ہے ...روح کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے. ہاں سچّی خوشی کب میسر ہوتی ہے جب ...ان کسی کی بلا غرض مدد کرتا ہے. کسی کے ہاتھ پاؤں سے، روپے پیسے سے ...غ سے کام آتا ہے، کسی کے دُکھ درد میں شریک ہوتا ہے

اِدھر حاجی جی اصرار کر کے سب کو کھانا کھلا رہے تھے اور اُدھر ماں اور بیٹی کا ...اصی گیارہ بارہ برس کی تھی، یہ حال تھا کہ کھانا کھاتی جاتی تھیں اور آنکھوں سے ...و ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے. یہ رونا کیسا تھا، اِس وقت یہ رونا اپنی مصیبت ...دیں نہ تھا بلکہ یہ رونا اظہارِ تشکّر کا تھا. کھاتی جاتی تھیں اور بیسیوں دعائیں دیتی ...تھیں. سب کھا پی چکے تو حاجی جی نے کہا "بہن گھبراؤ نہیں، کل صبح دس بجے ...پہلے پہلے تمہارے میاں تمہارے پاس آجائیں گے اور خاطر جمع رکھو اب ...ہ کو کین کو ہاتھ بھی نہ لگائیں گے. (تیس روپے دیکر) لو یہ تمہارے کام آئینگے"

ماں بیٹی نے جو اتنی بڑی رقم دیکھی (اِن غریبوں کے نزدیک تو یہ رقم ہی تھی) تو ایسی ...ت زدہ ہوئیں کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا. حاجی جی دل میں راحت و اطمینان کا ...لئے ہوئے چلے گئے.

صبح نو بجے وہ شخص جس کا نام معلوم ہوا کہ کریم الدین تھا، اپنے گھر پہنچا. سب ...ں کو چمٹا چمٹا کر پیار کیا. بیوی بھی میاں کو دیکھتے ہی نہال ہوگئیں اور بولیں:-

بیوی:۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اپنے حبیب کے طفیل سے حاجی جی کو عقبیٰ میں جنت دیجیو اور دُنیا میں ان کی ہر مُراد بر لائیو۔

میاں:۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ حاجی جی نے مجھے چھڑایا ہے؟

بیوی:۔ اے وہ یہاں رات کو آئے تھے۔ اتفاق سے یہاں سے گذر رہے تھے کہ ہم دونوں ماں بیٹوں کے رونے کی آواز سُنی اور اس طرح سے کھانا لائے یوں بچوں کو کھلایا پلایا اور تیس روپے دیکر چلے گئے۔

غرض بیوی نے رات کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ کہہ سُنایا

میاں:۔ حاجی جی آدمی نہیں فرشتہ ہیں میں نے معلوم کر لیا ہے۔ انہوں نے دارو غہ جی کو سو روپے دیئے ہیں جب اُس نے مجھے چھوڑا ورنہ کم سے کم چھ مہینے کی سزا ہوتی۔ اور دیکھا کیسے اچھے آدمی ہیں سُبحان اللہ کچھ تعریف ہی نہیں ہو سکتی مجھے تھانہ میں سے لائے تو ایک مسجد میں لے گئے اور وہاں جا کر مجھ سے توبہ کروائی اور قسم کھلوائی کہ اب کوکین یا شراب یا کسی اور قسم کی لت نہ لگاؤں گا پھر مجھے تین سو روپے دیئے (دیکھو یہ رہے) اور کہا کہ یہ تمہاری بچّی کے جہیز کے لئے ہیں۔

آیئے ذرا آپ کو میر حسن علی انسپکٹر پولیس کے دیوان خانے کی سیر کرائیں وہ دیکھیئے میر صاحب کیسے ٹھاٹھ سے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور ذرا آپ کی اور

آپ کے یاران مجلس کی گفتگو سنیئے کیا فرماتے ہیں۔

داروغہ جی :۔ دیوان جی! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ حاجی جی کا کریم الدین سے کیا تعلق ہے جو اپنے پاس سے سو روپے دیکر جھگڑا لے گئے۔

دیوان جی :۔ اس معمے کو ہمارے مرزا صاحب ہی حل کر سکتے ہیں۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہیں۔

داروغہ جی :۔ ہاں مرزا صاحب! آپ ہی فرمایئے۔

مرزا صاحب :۔ جناب بات یہ ہے کہ دوپہر سے جب سے آپ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے میں خود حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آپ میری عادت تو جانتے ہی ہیں کہ جب کسی بات کی الجھن ہوتی ہے تو نہ کھانا اچھا لگتا ہے نہ پینا۔ خیر مختصر یہ ہے کہ شام سے پہلے پہلے بندے نے پتہ لگا ہی لیا۔

داروغہ جی :۔ کیا کہنے ہیں، کیا کہنے ہیں!

دیوان جی :۔ بھئی خوب آدمی ہو۔ واللہ کمال کر دیا۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تم اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہو

داروغہ جی :۔ ہاں تو بتاؤ کیا پتہ لگایا؟

مرزا صاحب :۔ اجی حضرت! ہمارے حاجی جی کا کریم الدین کی بیوی سے تعلق ہے۔

دیوان جی :۔ نہیں یار مذاق نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ۔

مرزا صاحب :۔ بھلا میں کوئی بات بغیر تحقیق کئے کہتا ہوں۔

داروغہ جی :۔ تعجب کی بات ہے۔ اول تو اُن کی عمر خاصی ہے۔ دوسرے وہ تو حج کر آئے ہیں۔

مرزا صاحب :۔ جناب عمر کی تو یہ بات ہے کہ پچاس کے پیٹے میں ہوں گے اور عشق بازی اِسی عمر میں ہوتی ہے۔ جوانی کا عشق کچھ عشق نہیں ہوتا۔ وہ تو جذبات کا بھوت ہوتا ہے۔ جہاں جذبات مدھم پڑے اور حضرت عشق کھسکے پھر تو وہ جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ مزا ہی آجاتا ہے۔ رہا حج کر کے آنا اور حاجی بننا۔ سو جناب اکثر حاجی پاجی ہو کر آتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اب تک کے گناہ تو خانۂ کعبہ میں دُھل گئے اب جو گناہ کریں گے تو پھر جا کر حج کر آئیں گے اور اگر مر گئے تو تھوڑے ہی سے گناہوں کی تکلیف بھگتیں گے۔

داروغہ جی :۔ بھئی واہ مرزا صاحب! تمہاری تعریف نہیں ہو سکتی۔ کیا باتیں بتائی ہیں۔ ہم تو واللہ تمہارے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہیں یہ معلوم ہوا کیونکر؟

مرزا صاحب :۔ وہ جو اُن کے ہاں کی مغلانی ہیں نہ وہ (کھنکارے) وہ (کنپٹی کھجانے لگے)

دیوان جی :۔ (جلدی سے) وہ ان کی اماں ہیں

مرزا صاحب آداب عرض کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جوتہ پہننے لگے۔

داروغہ جی :۔ ہیں ہیں مرزا صاحب! بھئی تم تو مذاق میں خفا ہو گئے۔

ق

مرزا صاحب :۔ واہ صاحب واہ! یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ یہ ہمیشہ ایسا ہی بیہودہ مذا

کیا کرتے ہیں۔ میں انہیں بیسیوں دفعہ منع کر چکا ہوں مگر یہ باز نہیں آتے

دیوان جی :۔ (مرزا صاحب کے گلے میں باہیں ڈالکر) یار مرزا معاف کردو۔ درحقیقت مجھ سے بڑی بھاری غلطی ہوئی۔ اب کان پکڑتا ہوں۔ آیندہ کبھی ایسی گستاخی نہ ہوگی۔

داروغہ جی :۔ لو مرزا صاحب! بس اب غصے کو تھوک دو۔ دیکھو تو دیوان جی کیسے خلوص سے معافی مانگ رہے ہیں۔

مرزا صاحب :۔ جی ہاں یہ خوب بات ہوئی۔ پہلے تو دس جوتے مار دیئے پھر کہنے لگے صاحب معاف کردو۔ واہ صاحب واہ

داروغہ جی :۔ دیوان جی! دو روپے نکالو۔ یہ خالی خولی معافی نہیں چلے گی۔

داروغہ جی نے دیوان جی سے دو روپے لیکر نوکر کو دیئے کہ جا کر حلوہ سوہن لے آ۔

مرزا صاحب :۔ ہاں دیکھو تو یہ ایک بات بھی ہوئی۔

داروغہ جی :۔ ہاں تو مرزا صاحب تکلف کو بالائے طاق رکھئے اور اب فرمائیے کہ قصہ کیا ہے؟

مرزا صاحب :۔ اجی جناب وہ جو حاجی جی کے ہاں کی مُغلانی ہیں اُن سے بندے کی کچھ یاد اللہ ہے۔ بس میں سیدھا وہیں پہنچا اور اُن سے معلوم ہوا کہ کریم الدین کی بیوی کئی دفعہ وعظ کے بہانے سے آ بھی چکی ہے اور اس بات کی خبر حاجی جی کی

بیوی کو بھی ہے مگر بیچاری جگ ہنسائی کے خیال سے منہ سے نہیں نکالتیں۔

داروغہ جی:۔ یار کسی طرح اس حاجی باجی کو پھانسو۔ ہے بڑی موٹی مرغی۔

اس کے بعد آپس میں کچھ صلاح ومشورے ہوئے اور پھر محفل برخاست ہو گئی

ذرا دیکھئے تو یہ ہمارے سید انسپکٹر صاحب یہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی پر کیا بنا رہے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ آپ نے تو آج بڑی عجیب خبر سنائی مگر ہمیں یقین نہیں آتا۔

انسپکٹر:۔ حضور یقین تو پہلے پہل مجھے بھی نہیں آیا تھا مگر میں نے اچھی طرح سے تحقیقات کر لی ہے اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ حاجی عبدالوہاب ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں۔ حضور کو یاد ہو گا کہ پچھلے جاڑوں میں ہم نے کیسی محنت و جانفشانی سے چار ڈاکو پکڑے تھے۔ مقدمہ بالکل صاف تھا۔ مگر عدالت میں پہنچکر ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی خفیہ ہاتھ اِن کی مدد کر رہا ہے۔ چنانچہ سب کے سب صاف چھوٹے اور ہمیں بدنامی اٹھانی پڑی۔ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہو گیا ہے کہ حاجی جی کے روپے نے عدالت کی قلم پر قبضہ کر لیا تھا

سپرنٹنڈنٹ:۔ ہاں وہ واقعہ ہمیں بھی بہت اچھی طرح سے یاد ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا شخص جو حج کر آیا ہو اور ایسا دولتمند اور بارسوخ ہو کیسے ڈاکوؤں سے مل سکتا ہے؟

انسپکٹر:۔ حضور آپ کی ولایت میں کیا ایسے واقعات پیش نہیں آتے؟ ہم تو آئے دن بائسکوپ میں دیکھتے رہتے ہیں کہ بڑے بڑے نواب ڈاکے ڈالتے ہیں اور مزا یہ ہے کہ سوسائٹی میں اور ہی رنگ سے رہتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ ہاں یہ تو آپ سچ کہتے ہیں۔ بھیڑ کی کھال میں بہت سے بھیڑیئے ہوتے ہیں مگر آپ آج کس غرض سے آئے ہیں؟ ہم حاجی جی کو بغیر کسی ثبوت کے تو گرفتار نہیں کر سکتے۔

انسپکٹر:۔ میں تو حضور کو اطلاع کرنے آیا تھا۔ اگر حاجی جی دراصل ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں تو کبھی نہ کبھی ہمارے ہتھے چڑھ ہی جائیں گے۔

انسپکٹر صاحب یہ کہکر سلام کر کے چلے آئے۔

دن کے کوئی چار ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ نوکر نے آکر اطلاع کی کہ کوئی برقعہ پوش عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ حاجی جی اُس وقت اپنے دیوانخانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برقعہ پوش عورت کا نام سُن کر بہت گھبرائے کہ مجھ سے کونسی عورت ملنے آئی ہے۔ پھر نوکر سے کہا:۔

حاجی جی:۔ برقعہ کیسا ہے۔ میلا کچیلا ہے یا اُجلا ہے؟

نوکر:۔ برقعہ تو خاصا اُجلا ہے۔ فقیرنی تو نہیں معلوم ہوتی۔

حاجی جی:۔ پوچھ کر آؤ کیا نام ہے کہاں سے آئی ہے؟

نوکر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں آ کر کہا۔

نوکر:۔ وہ کہتی ہے میں کریم الدین کی بیوی ہوں جسے آپ نے اُس دن سَو روپے دیکر پولیس کے پنجے سے چھڑایا تھا۔

کریم الدین کی بیوی کا نام سُن کر حاجی جی کی نظروں میں اُس رات کا واقعہ پھر گیا سمجھے کہ پھر کوئی اُفتاد پڑی۔ نوکر سے کہا جلدی سے بلا لاؤ۔ اُس عورت نے آتے ہی حاجی جی کے پاؤں پکڑ لیئے اور رو کر بولی:۔

"حاجی جی! میرے میاں ......

حاجی جی:۔ بھاگوان کچھ بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہے؟

عورت:۔ (رو کر) میرے میاں کل شام سے غائب ہیں۔ مَیں رات بھر پریشان رہی۔ بُرے بُرے خیالات آتے رہے۔ کبھی کہتی کہ کہیں پھر پولیس کے پھندے میں نہ پھنس گئے ہوں۔ کبھی یہ خیال ہوتا کہ شاید پھر کسی بُری صحبت میں پڑ گئے مگر خیر صبح کو آئینگے تو اُن کی توبہ یاد دِلاؤں گی۔ غرض اسی اُدھیڑ بُن میں رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ سارا دِن بھی پریشانی میں گذرا۔ پولیس میں بھی ایک آدمی بھیجکر دِکھوایا وہاں بھی نہیں تھے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی ایک آدمی یہ پرچہ دے گیا ہے۔ جب سے اِسے پڑھوا کر سُنا ہے میرے ہاتھ پاؤں میں سنسنیاں آ رہی ہیں۔ جی بیٹھا جاتا ہے۔ (رو کر) ہائے اللہ میں کیا کروں۔ مجھ دُکھیا کا سوائے آپ کے اور کون بیٹھا ہے جو اِس مصیبت کو ٹالے۔

حاجی جی نے پرچہ لیکر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"ہم نے تمہارے میاں کریم الدین کو پکڑ رکھا ہے۔ اگر اس کی جان کی سلامتی چاہتی ہو تو آج رات کے بارہ بجے کسی کے ہاتھ پانچسو روپے بھجدو۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکتی ہو۔ اگر مقررہ وقت پر روپے نہ پہنچے تو ہم صبح کو کریم الدین کو قتل کر کے تمہارے پاس اُس کا سر بھجدیں گے جس کے ہاتھ روپے بھجو اُس سے کہدینا کہ بڑھیا کے نالے کے پاس جو پرانی گڑھی ہے اُسکے تہہ خانے میں چلا آئے کچھ خوف نہ کرے۔ ہم اُس کا بال بھی بیکا نہ کرینگے۔ ہاں یہ کان کھول کر سُن لو کہ اگر تم نے دھوکا دیا اور پولیس کو اس کی اطلاع کر دی تو یاد رکھو کہ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر ہم کریم الدین کو بڑی بُری طرح سے قتل کر دینگے۔"

حاجی جی پرچے کو پڑھکر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ڈاڑھی کھجا کر کہنے لگے:۔

حاجی جی:۔ بھئی یہ تو بڑی مشکل کی بات ہوئی۔ پانچ سو روپے تو کچھ بڑی بات نہیں ہیں دیدونگا مگر مشکل کی بات یہ ہے کہ لیکر کون جائے۔ وہ لوگ یقیناً ڈاکو ہیں۔ اُن کی بات کا اعتبار ہی کیا ہے۔ جو لیکر جائے اُس سے روپیہ بھی لے لیں اور اُسی جان سے بھی ماردیں۔ اس خیال سے کہ اسے ہماری قیام گاہ کا پتہ تو ہو ہی گیا ہے کل کلاں کو پولیس کو لے آیا تو ہم سب دھر لئے جائیں گے۔

عورت:۔ حاجی جی! آپ کہیں گے تو سہی کہ ایک دفعہ اس کے ساتھ سلوک کر دیا تو اب اس نے گھر ہی دیکھ لیا۔ ہمارا بال بال آپ کے احسانوں میں بندھا

ہوا ہے۔ رونگٹے رونگٹے سے دُعا نکلتی ہے کہ اللہ پاک حاجی جی کو ہمیشہ خوش و خرم اور تندرست رکھیو۔ خدا کے لئے اِس وقت مجھ دُکھیا کی مصیبت ٹال دیئے ہائے صبح کو میرے ننھے ننھے بچے یتیم ہو جائیں گے۔

یہ کہکر کچھ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ حاجی جی بیتاب ہو گئے اور کہنے لگے "نیک عورت! خاطر جمع رکھ۔ میں خود جاؤں گا۔ میں اللہ کے واسطے یہ کام کر رہا ہوں۔ وہی میرا محافظ ہوگا اور اگر اسی بہانے سے موت لکھی ہے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ تم جاکر اپنے گھر میں بیٹھو۔ اگر صبح تک تمہارے میاں نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ظالموں نے میرا اور اُن کا دونوں کا خاتمہ کردیا۔

وہ عورت دُعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

رات اندھیری ہُو کا عالم۔ سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ پُرانی گڑھی اوّل تو نہایت ہی ویران و شکستہ عمارت ہے جسے دِن میں دیکھکر وحشت ہوتی ہے۔ پھر جہاں یہ واقع ہے وہ نہایت ہی سُنسان جگہ ہے۔ کوسوں آبادی کا پتہ نہیں۔ نیک طبیعت کے کیا کہنے ہیں۔ سُبحان اللہ جس آدمی کو اللہ کی طرف کی لَو لگ گئی وہ نہ خطروں کو خاطر میں لاتا ہے نہ تکلیف کو تکلیف سمجھتا ہے۔ ہمارے حاجی جی ہی کو دیکھیے۔ اِس وقت آدھی رات کو ایسی بھیانک جگہ محض اللہ واسطے کام کرنے چلے آئے۔ ہر طرف جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے۔ گیدڑوں کے شور و غل سے آئے حواس غائب ہوئے

چلے جارہے ہیں مگر پہنیکی کا پتلا قدم اُٹھائے برابر گڑھی کی طرف بڑھا ہی چلا جارہا ہے۔ لیجئے وہ گڑھی کے شکستہ دروازے میں داخل ہو گئے۔ ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے، پتھروں پر سے لڑکتے لڑکاتے، گرتے پڑتے اُس عمارت میں پہنچ ہی گئے جسے کسی زمانہ میں بارہ دری کہتے تھے۔ یہاں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے کولی بھرلی اور کڑک کر بولا۔

"کون ہے سچ بتا ورنہ ابھی جان سے مارتا ہوں!"

حاجی جی پہلے تو بالکل ہی گھبرا گئے۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ پھر خدا کو یاد کیا تو معلوم ہوا کہ گویا نئی طاقت آگئی اور سنبھل کر کہا۔

"میں تمہارے روپے لایا ہوں!"

شخص:۔ کیسے روپے؟

حاجی جی:۔ جو تم نے منگائے تھے۔ ارے بھئی مجھے بھینچے کیوں جارہے ہو۔ اپنے سردار کے پاس لے چلو۔ میں اوّل تو اکیلا ہوں۔ علاوہ اس کے میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ چلو وہیں چلکر سب کچھ معلوم ہو جائے گا

اُس شخص نے حاجی جی کے کپڑوں کو ٹٹول کر اطمینان کر لیا کہ کوئی ہتھیار تو اس کے پاس نہیں۔ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر تہہ خانے کے دروازے پر لے گیا۔ یہاں پہنچکر اُس نے تین دفعہ دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک دفعہ تالی بجنے کی آواز آئی اُس شخص نے دو دفعہ تالیاں بجائیں۔ اُسی وقت دروازہ کھل گیا اور روشنی نظر آئی

یہاں حاجی جی نے دیکھا کہ نہایت صاف ستھرا فرش بچھا ہوا ہے جس پر گاؤ تکیے سے لگا ہوا ایک شخص بڑے رعب داب سے بیٹھا ہے۔ باقی دس آدمی اور بھی ادھر اُدھر بیٹھے ہیں۔ اُس شخص نے جو سب کا سردار معلوم ہوتا تھا، حاجی جی کو دیکھتے ہی اُس شخص سے جو انہیں لایا تھا کہا۔

"لطیف یہ کیسے لے آئے؟"

لطیف:۔ سردار! یہ شخص بارہ دری کے پاس ملا میں نے چُپ چاپ پیچھے سے آ کر اِس کی گولی بھر لی اور پوچھا تُو کون ہے، تو اس نے بالکل نڈر ہو کر جواب دیا کہ میں روپے لایا ہوں مجھے اپنے سردار کے پاس لے چلو اور کچھ خوف نہ کرو کیونکہ میں تنہا ہوں اور بلا ہتھیار ہوں۔

سردار:۔ اچھا دیکھو تو اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔

لطیف:۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔

سردار:۔ اچھا اس کا ہاتھ چھوڑ دو (حاجی جی سے) اے شخص تُو کون ہے۔ سچ سچ بتا ورنہ ابھی جان سے مار دیا جائیگا۔

حاجی جی:۔ (رقعہ دیکر) آپ اِسے پڑھئے۔

سردار پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اُس نے جلدی جلدی رقعہ پڑھا اور پھر کہا

سردار:۔ اِس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

حاجی جی:۔ میں پانچسو روپے لایا ہوں یہ لے لیجئے اور حسب وعدہ کریم الدین کو چھوڑ دیجئے

میں خدائے وحدہٗ لاشریک کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ اِس واقعہ یا اِس مقام کا ذکر نہ میں کروں گا نہ کریم الدین۔

سردار۔ کریم الدین تمہارا کون ہے؟

حاجی جی:۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ خدا کا بندہ ہے۔ میں اُس سے اپنی تمام عمر میں صرف ایک دفعہ مِلا ہوں اور یہ دوسری دفعہ اُسے مصیبت سے چھڑانے آیا ہوں للہ دیر نہ کیجئے۔ ورنہ اُس کی بیوی اور ننھے ننھے بچے رنج و الم سے گھُل گھُل کر مر جائینگے۔

سردار:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

حاجی جی:۔ مجھے عبدالوہاب کہتے ہیں۔

سردار نے ایک شخص کو بُلا کر اُس کے کان میں چُپکے سے کچھ کہا۔ وہ شخص چلا گیا اور دو منٹ میں ایک دوسرے آدمی کو لئے ہوئے آیا۔

سردار:۔ محبوب! دیکھو تو تم انہیں (حاجی جی کی طرف اِشارہ کرکے) پہچانتے ہو۔

محبوب:۔ سردار! یہ تو وہی حاجی جی ہیں جنہوں نے اُس دن مجھے دریا سے نکالا تھا

سردار:۔ (حاجی جی سے) حاجی جی! خوشا نصیب ہمارے کہ آپ سے محض اتفاقاً نیاز حاصل ہو گیا۔ میں نے جب سے محبوب سے وہ واقعہ سُنا تھا کہ آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک ایسے شخص کی جان بچائی جس سے آپ مطلق واقف نہ تھے۔ آپ کی ملاقات کا آرزومند تھا۔ حسنِ اتفاق سے آپ خود ہی تشریف

لے آئے۔ ایسے ہمدرد، کریم النفس، بہادر اور سخی اس زمانے میں کہاں!

حاجی جی۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اللہ واسطے کیا اور جو کچھ

کر رہا ہوں اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کر رہا ہوں۔ اگر اُسے میرا ایک فعل بھی

پسند آگیا تو سبحان اللہ! عاقبت سُدھر گئی۔ اب برائے مہربانی کریم الدین کو

جلدی بُلا بھیجئے اور اپنے روپے لے لیجئے۔

سردار۔ حاجی جی! میں سچ کہتا ہوں کہ یہ رقعہ نہ میں نے لکھا نہ لکھوایا اور نہ میں کریم الدین

کو جانتا ہوں کہ کون شخص ہے۔ نہ وہ یہاں ہے۔ ہاں اس رقعہ کو دیکھ کر اتنا ضرور

سمجھ گیا ہوں کہ کسی نے آپ کو فریب دیا ہے اور آپ پر کوئی نہ کوئی مصیبت آنے

والی ہے۔ مگر آپ یقین رکھیے کہ میں اپنی تمام قوت کے ساتھ انشاء اللہ آپ کی

مدد کروں گا اور جہاں تک ہو سکے گا آپ کو مصیبت سے بچاؤں گا۔ اب آپ

گھر تشریف لے جائیے رات زیادہ آگئی ہے۔ بال بچے پریشان ہوں گے۔

حاجی جی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک دم سے بیس پولیس کے جوان

بندوقیں چھتیائے گھس پڑے۔ اُن کے آگے آگے سید انسپکٹر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ

صاحب پولیس بھی تھے۔ اُن لوگوں نے آتے ہی سب کو باندھ لیا۔ انسپکٹر صاحب

نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا:۔

انسپکٹر۔ حضور دیکھیے میں نہ کہتا تھا کہ حاجی جی ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں

اب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کیسے اطمینان سے بیٹھے ہوئے

باتیں کر رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ خیر ہم اِن سب کو ایسی سزا دلوائیں گے کہ یہ لوگ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ اچھا اب مال کا پتہ لگاؤ۔

داروغہ جی نے کچھ آدمی تو یہاں چھوڑے اور باقی آدمیوں کو لیکر لالٹینوں اور لیمپوں کی روشنی میں مال تلاش کرنے چلے۔ متعدد دروازوں کے قفل توڑتے ہوئے یہ لوگ بہت سی کوٹھڑیوں میں گئے اور جگہ جگہ سے مال جمع کرنا شروع کیا۔ بہت سا سامان ہاتھ لگا۔ سب کو جمع کر کے اُسی کمرے میں پہنچے اور سپرنٹنڈنٹ کو کئی چیزیں دکھا کر داروغہ جی نے کہا۔

"دیکھئے حضور! یہ مال ہزاری لال کے ہار کا ہے جس کی اُس نے پچھلے ہفتے میں رپٹ لکھوائی تھی۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بس اب اِن سب کو لے چلیئے۔

حاجی جی تو بیچارے حواس باختہ ہو گئے۔ اُن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا اور میں کیسے پھنس گیا۔ اُن کو یہ معلوم کر کے بڑی شرمندگی ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کا خیال اُن کی طرف سے بہت برا ہو گیا کیونکہ وہ اب تک حُکّام کی نظروں میں بڑے عزت دار تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھیوں پر اکثر آیا جایا کرتے تھے اور چونکہ بے غرض ملتے تھے اِس لئے برابری کے ساتھ ملتے تھے۔

ڈاکوؤں کے سردار نے حاجی جی سے اُسی وقت کہدیا کہ حاجی جی یہ ہی وہ مصیبت

جس کی میں نے پیشینگوئی کی تھی اور یہ سب کرتوت اِس مردود تھانے دار کے ہیں.

تھانے دار نے یہ سُنتے ہی کہا:۔

بچّا! تھانے میں چلو کیسا مردود بنتا ہوں. بہت دِنوں کے بعد قابو میں آئے ہو

دُنیا کو خوب دونوں دونوں ہاتھوں سے لُوٹا ہے۔

ایک بات یہ بیان طلب رہ گئی کہ داروغہ میر حسن علی صاحب عین موقعہ پر کس طرح

پہنچ گئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ داروغہ جی کا ہمارے حاجی جی پر دانت تھا.

وہ اس "موٹی مرغی" کو دبوچنا چاہتے تھے. بات یہ ہوئی کہ پچھلے ہفتے دس بارہ ڈاکو سیٹھ

ہزاری لال کے ہاں آئے اور خاصا پندرہ بیس ہزار کا مال لے گئے. اِدھر اُس نے

پولیس میں رپٹ لکھوائی اُدھر ہمارے داروغہ جی کے دماغ میں ہیجان شروع ہوا. کچھ

دیر تک سوچتے رہے اور آخر "وہ مارا" کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دیوان جی کو لیے ہوئے

دیوان خانے میں پہنچے. مرزا صاحب کو بُلوایا اور جب وہ آگئے تو یوں گفتگو ہوئی.

داروغہ جی:۔ مرزا صاحب! وہ اُس دن کے مشورے کا وقت آگیا ہے. اب اُستاد

تمہارے ہاتھ بات ہے. یہ حاجی بچنے نہ پائے. دیکھو اِس طرح سیٹھ ہزاری لال

نے رپٹ لکھوائی ہے

مرزا صاحب:۔ داروغہ جی! سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پہلے ڈاکوؤں کا پتہ

لگائیے پھر اُس کے بعد سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔

چنانچہ بڑی کوشش، محنت اور تلاش کے بعد آخر پتہ چلا کہ ڈاکوؤں کا ٹھکانا

پرانی گڑھی کے ایک خفیہ تہہ خانے میں ہے جہاں رات کو سب ڈاکو جمع ہوتے ہیں اس کی اطلاع مرزا صاحب کو کی گئی اور اُن ہی کے مشورے سے ایک خط ڈاکوؤں کی طرف سے کریم الدین کی بیوی کو لکھوایا اور ایک عورت کو خوب سکھا پڑھا کر حاجی جی کے پاس بھیجا۔ جب حاجی جی نے خود جانے اور ڈاکوؤں کو رقم پہنچانے کا وعدہ کیا تو اُس عورت نے آکر دارو غہ جی کو خبر کی۔ یہ فوراً سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس پہنچے۔ سپرنٹنڈنٹ نے دیکھتے ہی پوچھا:۔

"کیوں انسپکٹر صاحب! ہزاری لال کے مقدمہ میں کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ کچھ ڈاکوؤں کا پتہ لگا۔

انسپکٹر:۔ میں بھی اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ بیس ہزار کی چوری کوئی معمولی بات نہ تھی اور مجھ کو حضور کے سامنے بھی سُرخ رُو ہونا تھا اس لئے نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات بھیس بدل کر ویرانوں اور کھنڈروں کے چکر لگانے لگا۔ آخر حضور کے اقبال سے ڈاکوؤں کی کمین گاہ کا پتہ لگا ہی لیا۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ (خوشی سے اُچھل کر) سچ مچ انسپکٹر صاحب! ہم آپ کو ہمیشہ سے بڑا قابل پولیس افسر خیال کرتے تھے مگر اس کی امید نہ تھی کہ آپ اتنی جلدی ڈاکوؤں کا پتہ لگا لیں گے۔ اچھا وہ لوگ کہاں چھپے ہیں؟

انسپکٹر:۔ حضور! وہ لوگ رہتے تو خبر نہیں کہاں ہیں مگر رات کو پرانی گڑھی کے تہہ خانے میں سب جمع ہوتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ مال بھی وہیں رکھتے ہونگے کیونکہ

وہ جگہ ایسی ہے جہاں کسی کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آج اگر حضور کی رائے ہو تو بیس سپاہی لیکر رات کے بارہ بجے وہاں پہنچ جائیں اور انہیں گرفتار کرلیں۔

سپرنٹنڈنٹ:۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے اور انسپکٹر صاحب سنیئے۔ ہم آپ کو بہت بڑا آدمی بنا دیں گے۔ ہم بڑے زور سے آپ کی سفارش صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل سے کریں گے اور عہدہ کی ترقی کے علاوہ آپ کو خان بہادری کا خطاب بھی دلوائیں گے۔

انسپکٹر صاحب نے بیسیوں خوشامد درآمد کی باتیں کیں، بہت سی دعائیں دیں اور شکریہ ادا کر کے چلے آئے۔ رات کو یہ سب لوگ پرانی گڑھی کی طرف روانہ ہو گئے اور ایسے وقت چلے کہ وہاں بجائے بارہ کے گیارہ ہی بجے پہنچ گئے۔ گڑھی کے قریب پہنچ کر داروغہ جی نے سب سپاہیوں اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ایک جگہ چھپا دیا اور خود کالا کمبل اوڑھ کر ایک جگہ دبک رہے بارہ بجے کے قریب انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص گڑھی کی طرف چلا آرہا ہے۔ سمجھ گئے کہ یہ حاجی جی ہیں چنانچہ کچھ فاصلہ لیئے اور ان کے درمیان چھوڑ کر دبے پاؤں بلّی کی طرح اُن کے پیچھے ہو لیئے۔ جب جب بارہ دری میں ڈاکو نے حاجی جی کی کولی بھری ہے تو یہ دہیں پیچھے موجود تھے انہوں نے ساری باتیں سُنیں اور تین دفعہ دروازہ کھٹکنے اور دو دفعہ تالی بجانے کا خفیہ اشارہ بھی معلوم کرلیا۔ جب حاجی جی اندر چلے گئے تو یہ جلدی سے آکر اپنے

ساتھیوں سے مِل گئے اور انہیں لیکر ایک دم سے ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچے۔ پھر جو کچھ ہوا آپ سُن ہی چکے ہیں۔

رات بھر ڈاکوؤں کے ساتھ بیچارے حاجی جی بھی حوالات میں رہے۔ صبح کو سپرنٹنڈنٹ پولیس، داروغہ جی، ہزاری لال اور چار سپاہی حاجی جی کو اُن کے مکان پر لے گئے ——— کیوں؟ ——— یہ بھی بتاؤں؟ اچھا تو سُنیئے:

حاجی جی ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے۔ گویا خود بھی ڈاکو تھے۔ تو اُن کو مالِ مسروقہ میں سے کچھ حصّہ بھی ضرور ملا ہوگا۔ لہٰذا اُن کے مکان کی تلاشی لی جائے گی اور چوری کا مال برآمد ہوگا۔

ذرا دیکھنا آج حاجی جی کِس شان سے اپنے محلّے میں داخل ہو رہے ہیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں۔ دو سپاہی آگے ہیں دو پیچھے۔ ساتھ ہیں انسپکٹر صاحب اور انگریز سپرنٹنڈنٹ بھی ہے۔ جس محلّے میں سے کبھی موٹر میں سے اُترتے تھے کبھی لینڈو میں سے، جہاں دو دو خدمت گار ساتھ رہتے تھے، جہاں لوگ اُنہیں جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے اور یہ بہ خندہ پیشانی ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر سب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے آتے تھے، جس محلّے کا بچّہ بچّہ اُن کو باپ سمجھتا تھا اور محبت کے مارے ٹانگوں میں لپٹا جاتا تھا، جہاں کے جوان بوڑھے سب ہی اُن کو فرشتہ سمجھتے تھے آج کیا ستم ہے کہ زمانہ ایسی پاک اور مقدس ہستی کو اس شکل سے لا رہا ہے۔ بچے سہمے ہوئے کھڑے تک رہے ہیں۔ آج کوئی ٹانگوں میں نہیں لپٹتا۔ جوان

اور بوڑھے انگشت بدنداں ہیں۔ حیران ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ راتوں رات یہ کیا ہوگیا۔

مصیبتیں بہتوں پر بھی آئی ہیں اور اس طرح کی آئی ہیں کہ بیان کرتے کلیجہ منہ کو آتا ہے تو اگر اُن کی مصائب و تکالیف کا خیال کرو تو حاجی جی کی مصیبت کچھ بھی نہیں لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ آزمائش کی یہ صورت بڑی تکلیف دہ ہے۔ اس سے روح کو صدمہ ہوتا ہے۔

حاجی جی کی یہ حالت ہے کہ سر نیچا ہے، آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی ہے محلّے والوں کے سامنے جیسی کچھ گذری سو گذری مگر یہ خیال روح کو تڑپائے جا رہا ہے کہ ہائے اس شکل سے گھر میں کیسے گھسوں گا۔

کسی نے دوڑ کر گھر میں بھی خبر کر دی۔ بیوی پچھاڑ کھا کر گریں، بیٹی نے ہائے ابا کہکر سر کے بال نوچ لیے، بیٹا ننگے سر ننگے پاؤں نکل بھاگا۔ غرض کل جو گھر عشرتکدہ تھا آج ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔

بال بچّوں والو! خدا تم پر کبھی ایسی مصیبت نہ ڈالے۔ ذرا اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھکر دیکھنا۔ ہائے یہ ذلت و رسوائی برداشت کرنے کے قابل ہے؟ جوان بیٹا مر جائے، چھ مہینے کی بیاہی بیٹی بیوہ ہو جائے، چور گھر کا مال و اسباب اس طرح لیجائیں کہ تنکا تک نہ چھوڑیں یہ ساری مصیبتیں ہیں اور سخت تکلیف دہ ہیں۔ اس میں رنج ہوتا ہے، صدمہ ہوتا ہے آنکھوں سے جھڑی لگتی ہے مگر خدا کی قسم انسان ذلیل نہیں ہوتا۔ مظلوم ہوتا ہے روتا ہے

تو دیکھنے والے بھی روتے ہیں مگر وہ رونا اور ہے اور یہ رونا اور۔ دُنیا والوں کی آنکھیں ہیں دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں۔ کان ہیں سُنتے ہیں اور سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ دُنیا والوں کی پاس علم غیب نہیں ہے کہ ہر واقعہ کو اصلی رنگ میں دیکھیں۔ مختصر یہ کہ گھر والوں پر جیسی کچھ گذری گذری، حاجی جی کے دَم پر جو کچھ بنی بنی۔ پولیس کے ہاتھ کچھ گہنا۔ کچھ برتن کچھ کپڑے لگ ہی گئے جنہیں ہزاری لال نے فوراً شناخت کر لیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب سامان بی مغلانی کی معرفت حاجی جی کے ہاں رکھوا دیا گیا تھا۔

حوالات میں بیٹا باپ سے ملنے گیا تو ڈاکوؤں کے سردار نے اُس سے کہدیا کہ یہ ساری کارروائی اِس تھانے دار کی ہے بیٹے کی رگوں میں جوانی کا خون تھا۔ فوراً بولا کہ میں ابھی جا کر اِس شیطانِ مجسم کو جان سے مارتا ہوں۔ مگر باپ نے کہا کہ بیٹا انتقام کا خیال ہرگز نہ کرنا۔ تم یا کوئی اور شخص انتقام نہیں لے سکتے۔ انتقام خدائے بزرگ و برتر کے اختیار میں ہے۔ وہی لے سکتا ہے اور خوب لے سکتا ہے۔

حاجی جی کے گھر میں عورتوں اور مردوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ کریم الدین اور اُس کی بیوی نے جو سُنا تو دوڑے ہوئے آئے اور رو رو کر حاجی جی کے احسانات بیان کرنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ یہ کسی دُشمن کا کام ہے۔ حاجی جی تو فرشتہ ہیں بھلا وہ ایسا کر سکتے ہیں آج معلوم ہوا کہ حاجی جی نے کتنے آدمیوں کے ساتھ ہمدردی سلوک اور مہربانیاں کی تھیں اور اِس طرح کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔

داروغہ جی نے سہ پہر کو حاجی جی کے بیٹے کو بلوایا۔ وہ گیا تو کہا:۔

داروغہ جی:۔ سنو برخوردار! یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ حاجی جی چور ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں یا نہیں مگر واقعات کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا۔ حاجی جی ڈاکوؤں کے سردار کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہوئے پائے گئے۔ خود سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ علاوہ ازیں مالِ مسروقہ اُن کے مکان سے برآمد ہوا جسے ہزاری لال نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی موجودگی میں شناخت کر لیا۔ ایسی حالت میں مقدمہ بالکل صاف ہے۔ چالان ہوتے ہی تین سال کی رکھی ہوئی ہے۔ مگر مجھے چونکہ شریفوں کے ساتھ فطرتاً ہمدردی ہے اس لئے میں جہاں تک ہو سکے گا کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی منت خوشامد کر کے حاجی جی کو صاف چھڑا لوں گا مگر (ڈاڑھی کھجا کر) مگر ہاں (کھنکار کر) دیکھو بھئی صاف بات ہے (رومال سے ناک پونچھ کر) دراصل روپیہ ہاتھ پاؤں کا میل ہے جب عزت پر آبنی تو گویا شریف کی جان پر آبنی تو ایسی حالت میں روپے کا منہ نہ کرنا چاہیئے۔

یہ سُن کر ستار (حاجی جی کا لڑکا) کا منہ سُرخ ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں بے قابو ہونے لگے۔ دل نے کہا کہ ظالم، بدمعاش، دغاباز کا گلا گھونٹ دے مگر حاجی جی کی شکل سامنے آ گئی جسنے کہا "نا بیٹا خبردار! شیطان کے بہکانے میں نہ آئیو" خیر مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس وقت خون کے سے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔

داروغہ جی:۔ کیوں میاں! تم سمجھ تو گئے ہوگے یا مفصل کہوں؟

ستّار:۔ آپ کو کتنے روپے کی ضرورت ہے؟

داروغہ جی:۔ برخوردار یہ تم نے کیا سوال کیا۔ ارے بھئی روپیہ تو ایسی چیز ہے کہ جتنا بھی آئے تھوڑا ہے۔ ضرورت کیسی۔ اِس کی ہر وقت انسان کو ضرورت ہوتی ہے اور ایک ضرورت نکل جائے تو خبر نہیں کتنی ضرورتیں اور پیدا ہو جاتی ہیں۔

ستّار:۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کتنے روپے کے بدلے میرے والد کو چھوڑ دینگے؟

داروغہ جی:۔ بھئی بات یہ ہے کہ (کھنکار کر) ایک کا منہ بند کرنا ہوتا تو بات ہی اور تھی یعنی فقط میرا اپنا ہی حساب ہوتا تو دو تین سو کی بات تھی مگر تم جانتے ہو کہ بیس سپاہی ساتھ تھے۔ اِن سب کا منہ بند کرنا ہے اور سب سے بڑے گرو گھنٹال ہیں یعنی سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ جتنے بڑے افسر ہوتے ہیں اُتنی ہی بڑی رقم چاہتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ بھئی دو ہزار روپے میں یہ کام ہو سکے گا۔ اسمیں سے ایک ہزار تو یک مشت سپرنٹنڈنٹ صاحب کی کوٹھی پر پہنچے گا اور ایکہزار میں مجھ سمیت اکیس آدمی ہیں۔

ستّار:۔ یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔

داروغہ جی:۔ اس سے کم میں تو یہ کام ہو بھی نہیں سکتا اور رقم کون سی بڑی ہے۔ تم جیسے رئیسوں کے نزدیک تو کچھ بھی بات نہیں اور خاص کر عزت کے مقابلہ میں۔

ستار:۔ میں ایک ہزار دے سکتا ہوں۔

داروغہ جی نے دیکھا کہ لڑکا دب گیا تو ذرا تیز ہو کر بولے۔

داروغہ جی:۔ ہونہہ آخر کو بچہ! لگے بنیوں کی طرح سے مول تول کرنے۔ اچھا بھئی تم جانو تمہارا کام جانے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا مگر یہ خوب سمجھ لو کہ اپنے بچپنے سے تم اپنے والد کو تین سال کے لئے جیل خانے بھیج رہے ہو جہاں وہ غریب چکی پیستے پیستے مرجائینگے۔

یہ سُن کر ستار کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ داروغہ جی سمجھ گئے کہ تاڈ گرم ہے جلدی سے بولے:۔

داروغہ جی:۔ بس اب آپ تشریف لے جائیے مگر یاد رکھئے کہ اگر رات کے ۸ بجے سے پہلے پہلے دو ہزار روپے میرے پاس نہ پہنچے تو پھر معاملہ میرے قابو سے باہر ہو جائے گا۔

ستار گھر پہنچا تو اپنی والدہ سے ذکر کیا وہ سُنتے ہی بولیں۔

والدہ:۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ بیٹا جلدی سے جا کر اُس موئے کا منہ جھُلس آ۔ یہ لے کنجی۔ میرے صندوق میں سے نوٹ نکال لا۔

اِدھر سے بہن جلدی سے بولی:۔

بہن:۔ اے بھائی! ایک ہزار کے نوٹ اور رکھ لو۔ شاید وہ ملعون دو ہزار پر بھی قائم نہ رہے۔ اور دیکھنا بھائی (رونے لگتی ہے) اچھی میرے ابا کو موٹر میں لانا۔

ستار روپیہ لے کر پہنچا۔ داروغہ جی نے اسے دُور ہی سے دیکھکر دوسرے کمرے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُس کمرے میں چلے گئے۔ وہاں جا کر پہلے تو دروازہ بند کر دیا اور پھر کہا۔

داروغہ جی:۔ روپے لے لائے؟

ستار:۔ جی ہاں۔

داروغہ جی:۔ کتنے ہیں؟

ستار:۔ دو ہزار

داروغہ جی:۔ شاباش۔ دیکھو یہ سمجھداری کی باتیں ہیں۔

یہ کہکر نوٹ لئے اُنہیں گنا اور کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھکر بولے۔

داروغہ جی:۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں ابھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس چلتا ہوں۔

یہ کہکر ستار کو لئے ہوئے بازار میں آئے۔ تانگہ کیا اور تانگے والے سے کہا کہ سول لائن چل۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی پر۔ پھر ستار سے کہا

داروغہ جی:۔ تم کیوں حیران ہوتے ہو۔ جاؤ گھر جا کر اپنی والدہ صاحبہ کا اطمینان کر دو کہ گھنٹہ بھر میں حاجی جی گھر پہنچ جائیں گے۔

ستار چلا گیا اور جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ تھانے دار میرے سامنے تانگے پر بیٹھکر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی کوٹھی پر گیا ہے۔

اِدھر داروغہ جی شہر میں پھر پھرا کر تھانے میں پلٹ آئے۔ دو ہزار روپے

میں سے ایک پیسہ بھی کسی کو نہ دیا اور نہ کسی کو اس کی خبر ہی ہوئی۔

حاجی جی کے گھر میں بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا کہ اب آتے ہیں، اب آتے ہیں۔ ہر ایک کی دروازے ہی پر نظر تھی۔ آخر جب ایک گھنٹہ گذر گیا تو ستار کی والدہ نے کہا۔

والدہ:۔ بیٹا جا دیکھ تو سہی۔ کہیں ایسا نہ ہو جو ذلت و رسوائی ہوئی ہے تو محلّے ہی میں قدم نہ رکھیں۔ جا بیٹا جلدی جا۔ سمجھا بجھا کر ایک دفعہ یہاں لے آ۔ پھر میں سمجھا لوں گی۔

بہن:۔ اچھی بھائی موٹر لیتے جاؤ۔ اور دیکھنا جب محلّے میں گھسو تو دور ہی سے ہارن بجاتے ہوئے آنا۔

ستّار بیچارہ موٹر لیکر تھانہ پر پہنچا تو داروغہ جی نے کہا۔

داروغہ جی:۔ بھئی میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گیا تھا۔ اُنھوں نے ایک ہزار روپے تو لے لئے ہیں اور کہا ہے کہ چونکہ سب کو معلوم ہو چکا ہے۔ گلی محلہ والے اور بازار والے سب ہی جان گئے ہیں کہ حاجی جی اِس طرح پکڑے گئے ہیں تو ایسی صورت میں اِس وقت اِن کو چھوڑ دینے سے حکّام ہم پر شبہہ کریںگے اور ہماری تمہاری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہاں مقدمہ پیش ہونے دو وہاں میں خود کہدوں گا اور تم بھی کہدینا کہ حاجی جی ڈاکوؤں کے ہاں بندھے ہوئے ملے تھے۔ اور حاجی جی سے کہلوا دیں گے کہ ڈاکو اُنہیں پکڑ کر لے گئے تھے۔

ستارا۔ تو مقدمہ کب پیش ہو گا؟

داروغہ جی:۔ پرسوں ہو گا۔ مگر تم والدہ صاحبہ کا اطمینان کر دینا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے روپے جب رکھ لئے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ کام نہ ہو جائے اور یہ بھی کہدینا کہ اب اس وقت سے حاجی جی ہمارے قیدی نہیں مہمان ہیں۔ اوّل تو میں اُنہیں اچھّے سے اچھا کھانا دوں گا اور نہایت آرام سے رکھوں گا۔ علاوہ از تم گھر سے کچھ کھانا لے آؤ تو اور بھی اچھا ہے۔

مختصر یہ کہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ڈیڑھ مہینہ میں تین پیشیاں ہوئیں۔ حاجی جی کی طرف سے بڑے بڑے نامی گرامی وکیل، بیرسٹر پیروکار ہوئے۔ بڑے بڑے امرا اور رؤسا نے ان کی نیک چلنی کی گواہیاں دیں مگر اس ثبوت کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی کہ حاجی جی ڈاکوؤں کے ساتھ بیٹھے ہوئے پکڑے گئے اور مالِ مسروقہ اُن کے گھر میں سے برآمد ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنی چشم دید شہادت کی بنا پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور ڈاکوؤں کو تین تین سال کی قید ہوئی تو حاجی جی کو صرف ایک سال قید بامشقت کی سزا ملی اس لئے کہ یہ ان کا پہلا جرم تھا۔

دوسرے دن دس روپے خرچ کر کے ستار جیل خانہ میں باپ سے ملا تو ماں نے کہدیا۔

ستار:۔ ابا جان! میری آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو رہی ہے۔ مجھ سے اماں اور بہن کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی۔ لاکھ سمجھاتا ہوں مگر اُن کا دل ہی قابو میں نہیں۔ نہ کھاتی

ہیں نہ بیتی ہیں، اُن کے جگر خراش بَین سے کلیجہ کٹا جاتا ہے. ابّا جان میرا خون کھول رہا ہے. آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں. مَیں اب انتقام لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حاجی جی:۔ دیکھو! میں نے اُس دن سمجھا دیا تھا۔ آج پھر تم نے انتقام کا نام لیا۔ ایسے مکروہ خیال کو ہرگز دماغ میں جگہ نہ دینا۔ ورنہ میں سخت ناراض ہوں گا۔

ستّار نے تھانہ دار کے دو ہزار روپے اینٹھنے کا قصہ بیان کر کے کہا:۔

ستّار:۔ یہ ساری کارروائی یقیناً اسی ملعون کی تھی۔ مگر گستاخی نہ خیال فرمایئے گا۔ میرا بارہا ارادہ ہوا کہ آپ سے پُوچھوں مگر ہمت نہ پڑی۔ آج ہمّت کر کے پُوچھتا ہوں کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ ڈاکوؤں کے ساتھ پائے گئے۔

حاجی جی نے کریم الدین کی بیوی کا آنا، رقعہ دکھانا، اپنا پرانی گڑھی جانا سب شروع سے آخر تک بیان کیا۔

ستّار:۔ کریم الدین اور اُس کی بیوی دونوں تو خود ہمارے ہاں آئے تھے۔ اب بھی آپ کو یقین نہیں آتا کہ یہ ساری شرارت اسی تھانہ دار کی ہے۔

حاجی جی:۔ یہ تو مجھے ڈاکوؤں کے سردار سے معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی میرے ساتھ فریب کر رہا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ کون ہے اور کیوں میرے پیچھے پڑا ہے۔ اب تو اس میں شبہہ کی گنجائش ہی نہیں کہ یہ کام میر صاحب ہی کا ہے۔

ستّار:۔ آپ اس شیطان کے بچے کو میر صاحب کہتے ہیں۔ یہ تو چھوٹا ہے بچھو۔ بھلا خیال

تو کیجئے کہ آپ جیسے فرشتہ خصلت آدمی کو یوں ذلیل و رُسوا کیا۔ یہ کوئی آدمی ک
کام ہے۔ اِس پاجی، ملعون، بدمعاش، کمینے، حرام خور کو اگر روپیہ ہی چاہ
تھا تو ہم چار ہزار دید بیتے۔ ابّا جان! چاہے کچھ بھی ہو میں اِسے نہیں چھوڑ
حاجی جی:۔ تم نے پھر وہی باتیں کیں؟
ستّار:۔ آپ کو میری فکر ہے تو لیجئے میں کہے بھی دیتا ہوں کہ میں نے سب کام ت
کرلیا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے اس کمبخت کو جہنّم میں نہ بھیجوں گا۔ ایک دوسرا انتخ
اِس کام کو کریگا جس کے بے گناہ بھائی کو اِس نے سزا دِلوائی تھی۔
حاجی جی:۔ ستّار! میں آخری مرتبہ تم سے کہتا ہوں کہ انتقام کا خیال دل سے نکال د
اور اگر نہیں مانتے تو آج سے تم میرے بیٹے نہ میں تمہارا باپ اور فقط یہی نہیں
بلکہ کان کھول کر سُن لو کہ جس دن مجھے تھانے دار کی موت کی خبر ہوئی اُسی د
میں نے بھی خودکشی کی۔ اپنا گلا گھونٹ کر مر جاؤں گا۔ گو یہ جانتا ہوں کہ خودکشی گ
کبیرہ ہے مگر تمہارے کارن میں یہ بھی کروں گا اور عاقبت میں دوزخ میں اپ
ٹھکانا بناؤں گا۔ اِدھر میں مروں گا اُدھر تم بھی نہ بچو گے۔ اس خیال میں نہ رہ
کہ دوسرے شخص سے کام کرداؤ گے تو تم بچ جاؤ گے۔ مقدمہ عدالت میں جا
ہی تمہیں بھی پھانسی ہوگی اور اگر پھانسی سے بچ گئے تو کالا پانی تو ہوا سمجھو۔ تو اگ
یوں میرے گھر کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہو اور اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں بیوہ اور اپ
بہن کو یتیم کرنا چاہتے ہو تو خیر تمہاری مرضی۔

ستار بیچارہ منہ لٹکائے باپ کے پاس سے چلا آیا۔ اب اس کا کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ رات رات بھر پڑا کروٹیں بدلا کرتا۔ اور سوچا کرتا۔ انتقام کا خیال دل سے نکالے نہیں نکلتا تھا۔ مگر باپ کی خودکشی اور گھر بھر کی تباہی کا جب خیال آتا تو کانپ اٹھتا۔ آخر اس نے یہ مشغلہ پیدا کیا کہ اپنے باپ کے ملنے جلنے والوں میں جاتا اور تھانے دار کی تمام و کمال کارروائی بیان کرتا۔ محلے میں، پاس پڑوس میں، اپنے عزیز و اقارب میں۔ غرض جس جگہ جاتا اپنے باپ کی بیگناہی اور تھانے دار کی سفاکی کے قصے بیان کرتا سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھی گیا۔ اور تھانے دار کی دو ہزار روپے رشوت لینے کا قصہ بیان کیا اور کریم الدین کی بیوی کے رقعہ کا حال بھی کہا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ شہر کے اکثر رئیسوں نے ہمارے پاس آکر حاجی جی کی بے گناہی کا یقین دلایا ہے اور ہم خود بھی جانتے ہیں کہ حاجی جی بڑے شریف اور نیک آدمی ہیں اور یہ بھی اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ وہ چھپ چھپ کر غریبوں کی مدد کیا کرتے ہیں جو انتہائی درجہ کا قابلِ تعریف فعل ہے مگر شہادت کے آگے نہ ہم کچھ کر سکتے تھے اور نہ عدالت۔ اب تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ساری کارروائی تھانہ دار کی تھی اور اس کمبخت نے میرے نام سے ہزار روپے لئے۔ حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں، ورنہ وہ ہرگز ایسی جرأت نہ کر سکتا کہ مجھ سے رشوت کا تذکرہ کرتا۔ اس لئے کہ جتنی نفرت مجھے رشوت سے ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نہ حاجی جی کو چھڑا سکتے

ہیں۔ نہ تھانے دار کو پھانس سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تاہم میں خفیہ طور پر نگرانی کرونگا اور اگر تھانے دار درحقیقت رشوت لینے والا ہے تو میں اُسے ہرگز نہ چھوڑوں گا

ستار سلام کر کے چلا آیا۔ ستار کا سپرنٹنڈنٹ سے ملنا کام کر گیا کہ وہ تھانے دار کی طرف سے کھٹک گیا اور جو وعدے وعید اُن کی ترقی اور خان بہادری کے کئے تھے اُن کی تکمیل کیلئے کچھ کوشش نہ کی۔

سال بھر آنکھ بند کرتے گذر گیا۔ یہ دیکھئے حاجی جی کے محلّے میں آج کیا ٹھاٹھ ہیں جگہ جگہ بانسوں کے دروازے بنے ہوئے ہیں جن میں محلّے والوں کے خلوص نے طرح طرح کی دلآویزی اور خوشنمائی پیدا کر دی ہے۔ جھنڈیاں لال سبز کپڑے کی اتنی کثرت سے لگائی ہیں کہ آسمان نہیں دکھائی دیتا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے کپڑوں پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ کہیں "خوش آمدید" ہے تو کہیں "بے گناہ کا ورودِ مسعود" لکھا ہے۔ زردوز، قصائی، زرکوب، تیلی، پاپڑ والے غرض ہندو مسلمان، چھوٹے بڑے سب اپنے کام دھندے چھوڑ چھاڑ کر منتظر کھڑے ہیں کہ حاجی جی کے پاک وجود کی زیارت کریں۔ یہ لو وہ موٹر کے ہارن کی آواز آئی لیجئے اِدھر سے "اللہ اکبر" کا شور بلند ہوا۔ گھر میں اس غل و شور کی آواز گئی تو دونوں ماں بیٹیاں بے اوسان ہو کر دروازے پر آگئیں۔ کس کا پردہ اور کہاں کا پردہ۔ آج اِن کے دماغ قیدِ شریعت

سے آزاد ہیں۔ سوائے خوشی کے کسی خیال کی دل و دماغ میں گنجائش نہیں۔

موٹر کا محلّے میں داخل ہونا تھا کہ محلّے والے پروانوں کی طرح گرنے لگے۔ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں ہمارے رحیم و کریم حاجی جی کو کیونکر گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ موٹر میں بیٹھے رہیں۔ اُتر پڑے۔ مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ لوگ گلے سے لپٹے جاتے تھے۔ کئی دفعہ تو بیچارے گرتے گرتے بچے۔ گو یہ ضرور ہے کہ گر کر کہاں جاتے کہیں گرنے کی جگہ تو تھی نہیں۔ موٹر کا یہ عالم تھا کہ پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی اور یہی حال ہمارے حاجی جی کا تھا کہ سر سے پاؤں تک پھولوں میں لدے ہوئے تھے۔ دس پانچ لڑکے بالوں کو جو جوش آیا تو بھیڑ کو چیر جار حاجی جی کے پاس پہنچ گئے اور جھٹ اللہ اکبر کہہ کر کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اب حاجی جی بیچارے بہتیرے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں کہ ارے خدا کے واسطے مجھے گنہگار نہ کرو۔ آدمی سواری لینے کے لئے ہے سواری دینے کے لئے نہیں۔ مگر خدا کی پناہ۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اسی شان سے گھر پہنچے۔ لڑکی تو "اچھی میرے ابّا" کہہ کر جو لپٹی تو چھوڑنے کا نام ہی نہ لیا۔ بیوی بیچاری سب کے سامنے کیا ملتی ملاتیں، آسمان کی طرف ہاتھ تھے اور "الٰہی تیرا شکر الٰہی تیرا شکر" کہہ رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہی آنکھوں سے سال بھر پہلے بھی اسی جگہ آنسو نکل رہے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا۔ مگر ہائے یہ کیا آنسو ہیں۔ خدا اُن آنسوؤں سے سب کو بچائے اور یہ آنسو سب کو نصیب کرے

کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ زمانہ کسے کہتے ہیں۔ اس نے جلدی سے جواب دیا ماضی، حال، مستقبل۔ اگر ہم سے کوئی یہی سوال کرے تو ایمان کی بات ہم تو فیل ہو جائیں۔ خبر نہیں اس پنج حرفی لفظ میں کون سی چھریاں چھپی ہوئی ہیں کہ ہمارا تو اس کا نام سنتے ہی دم فنا ہو جاتا ہے۔ جاڑے کا بخار تو ماشاء اللہ آپ کو بھی کئی دفعہ آ چکا ہو گا۔ بس عین بعین یہی حالت ہماری بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان زمانے صاحب علیہ الرحمۃ کی کیا تعریف کریں۔ خیر فیل تو ہیں ہی مگر کوشش کرتے ہیں سنیے۔ کنویں کا مینڈک کنویں ہی کو اپنی دنیا سمجھتا ہے تو بھئی ہم تو اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہمیں خبر نہیں کہ ستاروں اور سیاروں میں کتنے بڑے بڑے جانور ہوتے ہیں۔ ہم تو اپنی دنیا میں ویل مچھلی ہی کو سب سے بڑا جانور سمجھتے ہیں بھئی اس کی بھی کروٹ بلا کی ہوتی ہے۔ جہاز کے تو پرخچے اڑ جاتے ہیں مگر ہمارے زمانے صاحب جب کبھی کروٹ لیتے ہیں تو سلطنتوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیتے ہیں ممالک کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ دارا سا زبردست بادشاہ ان ہی کا شکوہ کرتے کرتے مر گیا۔ پرتھوی راج جو مہاراج ادھیراج کہلاتا تھا ان ہی کی کروٹ میں پسا اور ایسا پسا کہ سرمہ بن کر رہ گیا۔ یہی حضرت غریب ہمایوں کے جو پیچھے پڑے تو ایران تک بھگا کر دم لیا۔ شاہجہاں کو سب کہتے تھے کہ کیسا اچھا بادشاہ ہے کیسا عادل، منصف اور رعایا کا ہمدرد ہے مگر یہ حضرت کھڑے ہنسا کرتے تھے۔ آپ نے اس غریب کو بھی تاک رکھا تھا مگر کھلا رہے تھے۔ شاآپ نے یعنی آپ تماشا دیکھ

رہے تھے۔ بس ایک دفعہ جو ذراسی جُھرجُھری لی تو وہ عادل و منصف اور شان و شکوہ والا بادشاہ قید خانے میں نظر آیا۔ اُنہوں نے جب بادشاہوں کو نہ چھوڑا تو بھلا ہمارے میر حسن علی بیچارے کس گنتی میں تھے۔ اِن زمانے صاحب نے اُنہیں بھی ذراسی جھنجھوڑی دی۔ ایک رشوت کے مقدمے میں پھنس گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ ایسا شکنجے میں کسا کہ اُکس ہی نہ سکے۔ ڈیڑھ سال کی قید بامشقت ہوئی ڈگری الگ گئی۔ پنشن میں تین برس باقی تھے سارے حقوق پر پانی پھر گیا۔ اکثر اپنے یار قیدیوں کو رو رو کر اپنا قصہ سُنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حاجی جی کے انتقام کی سزا بھگت رہا ہوں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ حاجی جی کا نہیں۔ اللہ جبّار و قہّار کا انتقام تھا۔ حاجی جی بیچارے تو انتقام سے کوسوں دُور بھاگتے تھے۔ اور سنو بھئی وہ جو کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی تو حقیقت میں سچ ہے۔ بیچارے کو قید بُھگتتے کوئی چھ مہینے ہوئے ہونگے کہ ایک دن سُنا الائنس بنک کا دیوالہ نکل گیا۔ بارہ ہزار روپے ڈوبے بس یہی عمر بھر کی رشوت کی آمدنی تھی جو نقدی کی شکل میں تھی۔ اِس واقعہ کو بھی آٹھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن قید خانے ہی میں سُنا کہ گھر میں چوری ہوگئی اور ایسی ہوئی کہ سوائے مٹکوں اور چارپائیوں کے چوروں نے کوئی چیز نہ چھوڑی۔ گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ اب تھانے دار صاحب مرحوم —————— کیوں جناب یہ بات کاٹنے کا مرض آپ کو کب سے ہو گیا۔ ہاں یہ تو آپ ٹھیک فرماتے ہیں کہ "مرحوم" مرے ہوئے کو کہتے ہیں۔ مگر بھائی سنو تو سہی یہ بیچارہ تو مرے ہوئے سے بھی بدتر ہے۔ اُس وقت ستار

گلا کاٹ دیتا تو ایک منٹ میں تڑپ کر مر جاتا۔ مگر اب تو دن رات کی کوفت اور مصیبت ہے۔ ہاں تو تھانے دار صاحب مرحوم کو یہ سن کر ایسا صدمہ ہوا کہ "ہائے" کہکر پیچھے کو لڑھک گئے اور مرے کو ماریں شاہ مدار اُسی دن ستار بھی باپ سے چھپ کر جیل خانے آیا اور تھانے دار صاحب کو سلام کرکے فقط یہ شعر پڑھا اور چل دیا ؂

تم پشیماں رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

لو صاحب آج ہمارے تھانے دار صاحب بھی چھوٹ آئے۔ ذرا دیکھنا اُن کے محلے میں بھی کوئی جھنڈی دُنڈی نظر آتی ہے۔ نہیں صاحب جھنڈی تو ایک بھی نہیں دکھائی دیتی ہاں البتہ کچھ چیلیں تو منڈلا رہی ہیں۔ ہاں وہ بوا شبراتن نے اپنے پیارے بچے پر سے گوشت اُتارا ہے نہ۔ دیکھنا کیسے سکڑے سکڑائے آرہے ہیں جیسے کہیں سے چوری کرکے آئے ہیں۔ گھر میں گئے تو دونوں میاں بیوی بل کھل کر رو دھو لئے جب اس ضروری فرض سے فارغ ہوئے تو نہائے دھوئے۔ کپڑے بدلے۔ ذرا آدمیت کی جون میں آئے تو بیوی نے کھانا لاکر رکھا۔ کھا پی چکے تو بولے۔

داروغہ جی:۔ قیدخانے میں جسمانی تکلیف کے علاوہ روحانی تکلیف سب سے بڑی تضمیر کی ملامت تھی کہ میں نے جیسا کیا ویسا پایا۔ نہ حاجی جی جیسے زاہد و عابد اور نیکی سے آپتلے کو ستاتا نہ یوں خدا کے قہر میں مبتلا ہوتا۔ مگر اس کے علاوہ

یہ خیال بھی مارے ڈالتا تھا کہ خبر نہیں تم پر کیا گذر رہی ہوگی۔ نقد روپیہ تھا وہ تو بنک میں ڈوبا، گھر میں جو کچھ مال و اسباب تھا اُسے چوروں نے نہ چھوڑا جو کچھ گہنا بدن پر ہوگا اُس سے دو چار مہینے گُذارا کیا ہوگا۔ مگر آخر کب تک خبر نہیں گوٹا ٹکتی ہوگی، سلائی کا سیتی ہوگی یا کہیں نوکری کھانا پکانے کی کرلی ہوگی۔ ہاں بتاؤ تو کیسی گذری اور کیونکر گذری؟

بیوی:۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔

داروغہ جی:۔ اللہ تو مسبّب الاسباب ہے ہی مگر گھر بیٹھے تو کسی کو آن کر نہیں دیجاتا۔

بیوی:۔ مجھے تو گھر بیٹھے ہی آن کر دیجاتا ہے۔

داروغہ جی:۔ (جلدی سے) کچھ کہو تو سہی۔

بیوی:۔ تم جس دن قید میں گئے ہو اُسی دن عشائ کے وقت ایک فقیر نے آکر آواز آواز دی۔ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس نے مجھے دروازے پر بلاکر بہت کچھ سمجھایا بڑی تسلّی تشفی دی اور پچاس روپے دیکر چلا گیا۔ دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو پھر آیا اور پھر پچاس روپے دیکر چلا گیا۔ اور کہہ گیا کہ بہن میں تمہارا بھائی ہوں کچھ خیال نہ کرنا۔ اور کسی طرح کی فکر نہ کرنا۔ ڈیڑھ برس آنکھ بند کرتے گذر جائیگا۔ اور خاطر جمع رکھو۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تمہیں پچاس روپے مِل جایا کریں گے بس وہ دِن اور آج کا دِن مجھے برابر پہلی تاریخ کو وہی فقیر پچاس روپے دے جاتا ہے۔

داروغہ جی :۔ تم نے اُس کی شکل بھی دیکھی کیسی تھی ؟

بیوی :۔ رات کو بھلا شکل کیا دکھائی دیتی ہے بلکہ ایک دن میں جان کر چراغ لیکر گئی اور کواڑ کی اوٹ میں سے جھانک کر دیکھا تو سوائے کالے کمبل کے اور کچھ نہ دکھائی دیا۔

داروغہ جی :۔ آج کیا تاریخ ہے ؟

بیوی :۔ آج "انتیس" ہے۔ پرسوں وہ شاہ صاحب آئینگے۔

داروغہ جی سوچنے لگے۔ طرح طرح کے خیال دل میں آرہے تھے۔ کبھی کہتے کہ میرے دشمن تو بہت ہیں کہیں کوئی میرا گھر ہی برباد کرنے کی فکر میں تو نہیں ہے مگر یہ خیال جلدی ہی دُور ہو گیا اِس لئے کہ پینتالیس برس کی بڑی بی پر کون بیوقوف ڈورے ڈالتا یہ دو دن داروغہ جی کے بڑی اُلجھن اور پریشانی میں گذرے۔ خدا خدا کر کے وہ رات آئی جس کا انتظار تھا۔ شام ہی سے بیوی سے کہدیا تھا کہ آج میں معلوم کر کے رہونگا کہ یہ کون شخص ہے۔ تمہارا کوئی دُور پَرے کا رشتے دار ہے یا میرا کوئی دوست یا عزیز ہے۔ اِدھر "میری بہن" کی آواز آئی اور اُدھر آگے آگے بیوی اور پیچھے پیچھے میاں دروازے کے پاس پہنچے۔ بیوی نے ذرا سا دروازہ کھولا، ہاتھ بڑھایا اور نوٹ لے لئے اُدھر داروغہ جی چھلانگ مار کر اُس شخص سے لپٹ گئے اور بولے :۔

داروغہ جی :۔ اے رحمت کے فرشتے تُو کون ہے۔ خدا کے لئے جلدی سے بتا کہ میری اُلجھن دُور ہو ؟

شخص:۔ للہ مجھے چھوڑ دو۔ بس اب میرا کام ختم ہو گیا۔ آیندہ نہ آؤں گا۔

اب حالت یہ ہے کہ داروغہ جی اُس کے منہ پر سے کمبل کھینچنا چاہتے ہیں اور وہ اور بھی منہ لپیٹے لیتا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگے اسی کھینچا تانی میں کمبل منہ پر سے ہٹ گیا اور داروغہ جی "حاجی جی" کہکر بیہوش ہو گئے۔

حاجی جی نے داروغہ جی کو سنبھالا اور "بہن بہن" کہکر آواز دی۔ داروغہ جی کی بیوی دروازے میں کھڑی سب کچھ دیکھ سُن رہی تھیں۔ حاجی جی کا نام سُنتے ہی دل میں پنکھے لگ گئے۔ زار و قطار رونے لگیں۔ حاجی جی نے پھر پکارا۔ "بہن بہن! یہ بیہوش ہو گئے ہیں"۔

داروغہ جی کی بیوی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:۔

"حاجی جی! آپ سے کیا پردہ۔ انہیں گھر میں لے آیئے"۔

غرض دونوں داروغہ جی کو اِس شکل سے گھر میں لے گئے کہ ع

پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

تھوڑی دیر میں داروغہ جی کو ہوش آ گیا۔ آنکھ کھولتے ہی حاجی جی پر نظر پڑی۔ فوراً اُن کے پاؤں پکڑ لئے۔ کبھی چُومتے کبھی اُن سے اپنی آنکھیں رگڑتے۔ جوشِ گریہ کا یہ عالم تھا کہ اُن کے پاؤں تر ہو گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وضو کر کے آئے ہیں۔ حاجی جی نے بڑی مشکل سے پاؤں چھڑائے، داروغہ جی کو گلے سے لگایا، خود بھی روتے رہے۔ جب رو دھو کر جی ہلکا ہوا تو یوں گفتگو ہوئی:۔

داروغہ جی:۔ حاجی جی! خدا کا انتقام تو میں نے برداشت کر لیا۔ مجھے قید ہوئی۔ میرا روپیہ

بنک میں ڈوبا، میرے گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ یہ ساری مصیبتیں میں نے صبر و شکر سے جھیلیں۔ مگر آپ کے انتقام سے نہیں پنپ سکتا۔ یہ آپ کا انتقام خدائی انتقام سے ہزار گنا شدید ہے۔

حاجی جی:۔ استغفر اللہ! یہ کیا کہتے ہو بھئی انتقام کیسا؟

داروغہ جی:۔ اگر آپ جیلر کو رشوت دیکر میری تکالیف کو اور بڑھا دیتے۔ یا جیل سے چھوٹنے کے بعد آپ میری ناک کٹوا دیتے یا اور کوئی اس سے بھی سخت سزا دیکر انتقام لیتے تو میں برداشت کر لیتا مگر انتقام کی یہ شکل میری روح کو گھلائے دیتی ہے کہ جس حاجی نے آپ جیسے برگزیدہ شخص کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا اُس کی بیوی کو آپ نے بھیک مانگنے سے بچایا۔

حاجی جی:۔ (جلدی سے) خدا کے لئے اِس کا ذکر کرکے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ اور بھئی انتقام میں کیسے لیتا۔ تمہارا اس میں کیا قصور تھا۔ مجھے خدا نے میرے اعمال کی سزا دی تمہیں ذریعہ بنایا۔ تمہاری اِس معاملے میں بالکل ایک آلے کی سی حیثیت تھی۔ جیسے میں کسی کو لکڑی سے ماروں، تو وہ کیا سمجھے گا کہ مارنے والا کون ہے؟ میں یا لکڑی؟ ظاہر ہے کہ مارنے والا میں ہوں تو لکڑی سے انتقام لینا حماقت ہی ہے۔ اپنے معاملے میں انتقام کا سوال اگر پیدا ہو بھی تو خدا سے، نعوذ باللہ ہم خدا سے انتقام لے سکتے ہیں؟ اور بہ حیثیت ایک سچے مسلمان کے، اور یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ خدائے بزرگ و برتر جو کچھ کرتا ہے بالکل ٹھیک اور مناسب کرتا ہے۔

داروغہ جی :۔ (رو کر اور ہاتھ جوڑ کر) حاجی جی خدا کے لئے مجھ گنہ گار، ذلیل، کمینے اور ملعون کی خطا معاف کر دیجیے۔

حاجی جی :۔ (جلدی) سے امیں نے سچے دل سے معاف کیا اور میرے خدا نے معاف کیا

دوسرے ہی دن الائینس بنک کے مینجر کی چٹھی داروغہ جی کے نام آئی کہ بنک کی حالت اب اس قابل ہوگئی ہے کہ دہ روپے میں سے آٹھ آنے ادا کر دے۔ لہذا اگر آپ اپنی رقم لینی چاہتے ہیں تو فلاں جگہ سے وصول کر لیں۔

بس یہ خدا کی قدرت سمجھو یا اتفاق کی بات کہ حاجی جی کے معاف کرتے ہی بنک کے مینجر کی چٹھی بھی آگئی۔ نئی روشنی والے تو اسے اتفاقی امر خیال کریں گے مگر بھئی ہم تو کچھ ایسے پڑھے لکھے ہیں نہیں اور نہ ہمارا دماغ اس قابل ہے کہ نئی روشنی کے جذبات کو قبول کرے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ خدا کی قدرت اور اُس کی شانِ کبریائی تھی۔

سائیں اَکھیاں پھیریاں اور بیری مُلک جہان
اِک بر جھانکی پھر کی اور لکھن ہوئے سلام

میاں نے آنکھیں پھیریں تو سارا جہان دشمن ہوگیا اور میاں نے بنگاہِ لطف سے دیکھا تو جدھر جاؤ لاکھوں سلام ہو رہے ہیں۔ یہی تو مولا اپنے کلام پاک میں بھی فرماتا ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔

دیکھنا یہ آج منہ اندھیرے کون چیختا پھر رہا ہے۔ ارے توبہ توبہ یہ تو کوئی بیچارہ نمازیوں کو جگانے آیا ہے۔ اور سُنو تو منہ سے کیا پیارے بول نکل رہے ہیں۔

"چلو بھائی نمازیوں نماز کو چلو"۔ "اللہ کے پیارو اُٹھو"۔ "بھائی مسلمانوں ثواب بٹ رہا ہے چلو"۔

اوہو یہ تو ہمارے دارو غہ جی ہیں۔ واللہ کیا گُٹ پٹ کے کُندن بنے ہیں۔ اور آپ نے کچھ اور بھی سُنا؟ خاصا ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کر اپنے محلّے کی مسجد میں ایک حوض بنوایا ہے، کنویں کی اور فرش کی مرمّت کروائی ہے، نمازیوں کے لئے صفیں بچھوائی ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں، ساری مسجد کی جھاڑو اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں، علی الصباح نمازیوں کو اُن کے گھروں پر جا جاکر جگاتے ہیں۔ آخر اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ ہی لیا اور یہ بہترین رنگ ہے۔

فردوسِ تخیّل

پرسوں بازار میں جا بجا موٹے موٹے اشتہار لگے دیکھے. آج کل جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو کہیں بائسکوپ کے اشتہار دکھائی دیتے ہیں کہیں تھیٹر کے. کہیں طرح طرح کی بیڑیوں کے. گلی کوچوں کے نکڑ پر، لکڑی کے تختوں پر، پتھر کے چوکوں پر، دکانوں کے کواڑوں پر، مکانوں کی دیواروں پر. غرض جہاں دیکھو اشتہار ہی اشتہار دکھائی دیتے ہیں. اِن اشتہاروں کی سرخیاں ایسی عجیب و غریب ہوتی ہیں کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے.

پرسوں والے اشتہار کی سرخی "کام کی بات، سچّی حکایت، سنسنی خیز واقعات" جلی قلم سے لکھی ہوئی تھی. لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ جمع تھا. ایک پر ایک ٹوٹا پڑتا تھا. اشتہاروں کی وقعت تو میری نگاہ میں بہت ہی کم تھی. مگر لوگوں کے مجمع کثیر کو دیکھکر میں بھی ٹھٹک گیا اور پڑھنے لگا. لکھا تھا.

"کام کی بات، سچّی حکایت، سنسنی خیز واقعات"

شہر کے امیر و غریب، بچے بوڑھے سب سے التماس ہے کہ بتاریخ ۲۳ نومبر ۱۹۲۴ء

بوقت چار بجے دن راما تھیٹر میں تشریف لائیں اور میری حیرت انگیز داستان سُنیں۔ میں اپنے عجیب و غریب واقعات سُناؤں گا جنہیں سُنکر حاضرین دنگ رہ جائیں گے طوالت کے خوف سے اخباروں یا رسالوں میں نہیں لکھ سکتا اور نہ گھڑی گھڑی ہر شخص کو سُنا سکتا ہوں اِس لئے یہ صورت اختیار کی ہے۔ امید ہے کہ سب صاحبان وقت مقررہ پر ضرور تشریف لائیں گے۔

المشتہر قاضی رکن الدین

اشتہار پڑھکر ہر شخص اپنی اپنی بولیاں بولنے لگا۔ کسی نے کہا میاں کھانے کمانے کے ڈھنگ ہیں، بات وات کیا ہوگی۔ کوئی بولا ہاں ٹھیک تو ہے۔ جیسے جامع مسجد پر دوا فروش کبھی ہاتھوں کا شعبدہ دکھاتے ہیں، کبھی کالے سانپ کو سر سے بلند کر کے چیخنے چلّاتے ہیں اور جب بہت سے آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو پھر اپنی دواؤں کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک ترکیب ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اشتہار نہایت مختصر تھا۔ لفاظی کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ دل میں کریدنی سی لگ گئی کہ چلکر دیکھنا تو چاہیئے کہ قاضی جی کہتے کیا ہیں۔ اگر کچھ اور رنگ دیکھا تو اُٹھکر چلے آئیں گے۔ کوئی ٹکٹ تو ہے ہی نہیں جو پیسے برباد جانے کا رنج ہو۔ کل اتوار کو بجائے چار کے تین ہی بجے راما تھیٹر جا پہنچا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی سب سے پہلے پہنچوں گا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سو ڈیڑھ سو آدمی مجھ سے بھی پہلے کے پہنچے ہوئے ہیں۔ خیر میں اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی چار بجنے میں کچھ منٹ باقی

ہوں گے کہ سارا تھیٹر بھر گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ ٹھیک چار بجے قاضی صاحب پلیٹ فارم پر آئے اور آتے ہی کہنا شروع کیا۔

"ہندو مسلمان بھائیوں کی خدمت میں نہایت ادب سے سلام عرض کرتا ہوں اور سب صاحبان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کے اشتہار پر اتنی توجہ کی کہ ماشاء اللہ کثیر تعداد میں تشریف لے آئے۔ اب میں تصنع اور زمانہ سازی کی باتوں میں زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتا اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر بالکل سچ سچ عرض کرتا ہوں۔

میرے دادا بہادر شاہ بادشاہ کے زمانے میں شاہی خاندان کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور ہمارا خاندان نہایت فارغ البالی سے بسر اوقات کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے جہاں شاہی خاندان کو بے چراغ کیا وہاں ہمارے خاندان کے مٹانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دادا صاحب قبلہ تو بھاگتے میں ایک گوجر کے لٹھ سے شہید ہوئے والد صاحب قبلہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور دادی صاحبہ کو لیکر بمشکل تمام صدہا طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر پٹیالہ پہنچے۔ مختصر یہ کہ امن و امان ہونے کے بعد والد صاحب محکمہ بندوبست میں پٹواری ہو گئے۔ گو سوائے اردو کے کچھ نہ جانتے تھے مگر اگلے وقت تھے، اگلے لوگ تھے اچھے حاکم تھے۔ خوش قسمتی سے تحصیلداری تک پہنچ گئے۔ مجھے انٹرنس تک تعلیم دلائی مگر باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد حالات و واقعات نے ملازمت کرنے پر مجبور کیا تعلیم چھوٹ گئی۔ پچیس روپیہ ماہوار کی نوکری کرلی

شادی بھی ہوئی۔ بال بچے بھی ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب سو روپے ماہوار پاتا ہوں غریب گھر کا ہوں مگر اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔ اب تک بڑے اطمینان سے گذر رہی تھی۔ مگر ابھی حال ہی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ آج بیس دن ہوئے میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کئی بزرگوں سے ملا۔ اپنی سرگذشت سنائی۔ مگر کسی نے دردِ دل کی دوا نہ دی۔ اِس دل کی بے کلی سے تنگ آگیا ہوں۔ دفتر سے دو مہینے کی رخصت لے رکھی ہے۔"

اِتنا کہہ کر قاضی صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ حاضرین کو اُنکی سرگذشت سُننے کا ایسا اشتیاق ہوا کہ "فرمایئے فرمایئے ہم بیحد مشتاق ہیں" کے نعرے لگانے لگے۔ قاضی صاحب پھر کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے۔

"جی ہاں کوئی بیس دن کا ذکر ہے کہ میں صبح کی نماز پڑھکر ذرا ٹہلنے چلا گیا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ خدا کی طرف کچھ کو لگی ہوئی تھی۔ اُس کی ذرّہ نوازی اور بندہ پروری اپنی گناہ گاری اور نافرمانی کے خیالات، ندامت اور شرمساری کے جذبات دِل میں کچھ ایسے موجزن ہوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔ کچھ دیر بعد جو ہوش آیا تو دیکھا کہ دریا کے کنارے ٹہل رہا ہوں۔ سامنے سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ میں نے سری نگر کشمیر کے میلے میں ایک سے ایک اعلیٰ درجے کی اور سجی سجائی کشتی دیکھی ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں ایسے سنہری سنہلی کام کی اور ایسی آراستہ پیراستہ کشتی میں نے اپنی عمر میں

کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ یا الٰہی یہاں نہ کبھی بجرا دیکھا نہ ڈونگا نہ کشتی سوائے ایک ٹوٹی پھوٹی ناؤ کے جو اس پار کے آدمی اُس پار اور اُس پار کے اِس پار پہنچانے کے کام آتی ہے۔ پھر یہ کشتی کہاں سے آگئی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کشتی میرے قریب آگئی۔ اُس میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جوان خوبصورت سا اور دو بزرگ صورت۔ کشتی میرے قریب آ کر ٹھہری۔ اِن بزرگوں میں سے ایک کنارے پر اُترا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا "چلو میاں صاحبزادے بہت دیر ہوگئی"۔ میں بلا سوچے سمجھے کشتی میں بیٹھ گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی کشتی بڑی تیزی سے چلی جس رفتار سے وہ جا رہی تھی اُس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ موٹر پوری تیزی سے چھوڑ دیجئے ڈاک گاڑی کو جتنا تیز جا سکتی ہے چلائیے۔ زیادہ سے زیادہ تیز رفتار غالباً سو میل فی گھنٹہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ وائسرائے کی سپیشل ڈاک گاڑی میں سوار ہوا تھا۔ میرے خیال میں اُس کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ ہوگی مگر اتنی تیز جا رہی تھی کہ کھڑکی کے باہر دیکھنے سے سر چکرانے لگتا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کشتی کی رفتار کے آگے وہ ڈاک گاڑی ہیچ تھی اور مزے کی بات سنیے۔ یہی اپنا دریائے جمنا تھا جس کا پاٹ برسات میں تو خیر میل بھر کا ہو بھی جاتا ہے مگر آج کل تو پاؤ میل بھی نہیں تھا۔ اِسی دریا کا پاٹ بڑھتے بڑھتے اِتنا بڑھا اتنا بڑھا کہ سمندر ہو گیا۔ ہنسیے نہیں۔ خدا کے لئے پہلے میری سرگذشت سُن لیجئے۔ پھر آپ کو اختیار ہے۔ آپ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہوں گے مگر بخدا میں دیوانہ نہیں ہوں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔

وہ کشتی دن بھر اسی تیزی سے چلتی رہی۔ سہ پہر کو اُس کی رفتار دھیمی پڑی۔ اب ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں ایک طرف کنارا نظر آرہا تھا اور دور پرے کچھ سرسبز پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں سمندر میں سے ایک طرف دریا کی طرح کی لمبی سی دھار نکلی ہوئی تھی۔ اُسی دھار کی طرف کشتی چلی۔ اب ہم ایک دریا میں تھے جس کے پانی میں وہ سمندر کا سا زور و شور نہیں تھا۔ کشتی اس وقت کوئی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔ دونوں کناروں پر نہایت خوشنما پہاڑ تھے۔ کہیں کہیں آبشار بھی گر رہے تھے۔ میں تو اس خوشنما نظارے میں ایسا محو ہوا کہ وقت یا مقام کا کچھ خیال ہی نہ رہا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ اپنوں میں ہوں یا غیروں کے ساتھ۔ تھوڑی دیر بعد کشتی بہت ہی آہستہ چلنے لگی کیونکہ دریا تنگ ہو کر نہر کی شکل کا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف چٹانیں تھیں۔ کہیں کہیں دونوں کناروں کے درخت آپس میں اس طرح مل گئے تھے کہ پھاٹک سا بن گیا تھا۔ درختوں پر طرح طرح کے پرندے بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا۔ یہ راستہ کوئی تین میل کا ہو گا۔ اس کے بعد چٹانوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کھلا میدان نظر آنے لگا۔ دریا کا پاٹ بھی کوئی آدھے میل کا ہو گیا۔ سامنے دو تین میل کے فاصلے پر ایک بڑا شہر نظر آرہا تھا جس کی عالی شان اور سر بفلک عمارتیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ یہ کسی بڑے بادشاہ کا دارالحکومت ہے۔

اب سارے دریا میں کشتیاں ہی کشتیاں نظر آنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دریا پر میلہ لگا ہوا ہے۔ ہماری کشتی نہایت خوبصورت اور خوشنما پُلوں کے نیچے سے ہوتی

ہوئی ایک عالی شان عمارت کے پاس جا کر ٹھیری (جو بعد میں معلوم ہوا کہ شاہی محل ہے) وہ نوجوان اور دونوں بزرگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی احمقوں کی شکل بنائے تینوں کا منہ تکتا ہوا اُٹھا۔ بیسیوں اہالی موالی ہمارے استقبال کو آئے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر سے ہوتے ہوئے دروازے میں پہنچے۔ دروازے ہی کو دیکھکر خدا کی قدرت نظر آئی۔ میں نے کئی دفعہ دہلی کے قلعہ کے دربارِ خاص کو بڑی دلچسپی اور غور سے دیکھا ہے اور شاہانِ مغلیہ کے وقت کی شان و شوکت کا پورا نقشہ میرے دل میں جم چکا ہے کہ جس زمانہ میں شاہجہاں اور اورنگزیب کا دور دورہ ہوگا یہاں جواہرات کی پچی کاری کی کیا شان ہوگی۔ مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اس محل کے دروازے کے جواہر دار نقش و نگار کے آگے دہلی کا دربارِ خاص ماند تھا۔ اگر محل کی نہروں، حوضوں، فواروں، روشوں، پٹڑیوں، درختوں، پھولوں اور منبت کاری کی دیواروں، جواہرات کی مرصع کاریوں، زردوزی پردوں اور دیگر ساز و سامان کی تشریح کی جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو۔ اِس لئے میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا صرف اِسی قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے وہاں وہ دیکھا جو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ آپ صاحبان ہنس رہے ہیں۔ اِسے میرا خواب سمجھ رہے ہیں مگر جب میں آپ کو متعدد ثبوت دوں تا اُس وقت آپ یقین کرلیں گے کہ یہ خواب نہیں ہے مگر جس طرح میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ خواب نہیں تو آخر کیا ہے اسی طرح آپ بھی نہ سمجھ سکیں گے اور نقشِ حیرت بنکر ایک دوسرے کا منہ تکیں گے۔ خیر

نوجوان نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اب ہم اپنے گھر آگئے"۔ میں جواب تو کیا دیتا حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اِتنے میں کچھ معزز لوگ نہایت اعلیٰ درجے کا لباس زیب تن کیئے آئے۔ اُن میں ایک سن رسیدہ بزرگ جو سب کے سردار معلوم ہوتے تھے، آگے آگے تھے۔ اِنہی بزرگ نے آگے بڑھکر نوجوان سے پوچھا۔

"سالار! گوہرِ مقصود ہاتھ آیا؟"

سالار:۔ جی ہاں۔ خدا کی مہربانی سے۔

بزرگ:۔ اچھا تو جلدی کرو۔ سب سامان تیار ہے۔ شام بھی ہوگئی ہے۔

پھر اُن بزرگ سے جنہوں نے مجھے کشتی میں سوار کیا تھا، مخاطب ہو کر کہا:۔

بزرگ:۔ ناصر جنگ! تمہیں اِس سفر میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی؟

ناصر جنگ:۔ جی نہیں حضور کی عنایت اور خدا کی مہربانی سے یہ سفر کچھ معلوم ہی نہیں دیا

اِس بزرگ نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور بڑے ادب سے مجھ سے کہنے لگا۔

"حضور تشریف لے چلیئے۔"

میں چپ چاپ اُس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے حمّام میں لے گیا جہاں ملازمین نے مجھے نہلایا —— معزز حاضرین! میں طوالت کے خوف سے صرف واقعات بیان کر رہا ہوں۔ اگر حمّام کی آرائش و زیبائش کا حال بیان کروں تو آج کا سارا وقت اسی میں ختم ہو جائے۔

نہلانے کے بعد وہی شخص آیا اور اپنے ہاتھ سے نہایت ہی عمدہ لباس مجھے پہنایا۔ کپڑے پہنتے میں میں نے اُس سے پوچھا کہ بھائی خدا کے لئے کچھ بتاؤ تو یہ کون لوگ ہیں، کیا مقام ہے، میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ اُس شخص نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"جن کے حکم سے میں آپ کو نہلانے لایا ہوں وہ تو ہمارے بادشاہ سیّدی یونس ہیں اور وہ جوان شخص ہمارے شہزادے سیّدی ادریس سالار ہیں اور وہ بزرگ نامر جنگ وزیر اعظم ہیں۔ باقی اور امراء اور مصاحبین ہیں۔ شہزادی زارا کی آج شادی ہے۔ اور شاید آپ ہی دُولہا ہیں مگر میں ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آپ کے ساتھ شہزادی کا نکاح ہو تو چون و چرانہ کیجئے گا۔"

میں یہ باتیں سُن کر حیران و ششدر رہ گیا۔ دماغ چکر کھانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جاگ رہا ہوں یا عالم خواب ہے۔ بالکل دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ کبھی بید مشک کا شیشہ اُٹھا کر اپنے سر پر دے مارا کہ دیکھوں چوٹ لگتی ہے یا نہیں۔ کبھی انگلی دانتوں سے دبائی۔ کبھی ران میں زور سے چُٹکی لی۔ جب سب طرح یقین ہو گیا کہ عالم بیداری ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُسی شخص نے آہستہ سے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔

"حضور ایسی باتیں نہ کیجئے کوئی دیکھ لے گا۔ اللہ کا شکر کیجئے کہ آپ کو معراج عروج پر پہنچا دیا۔ چلئے دیر ہو رہی ہے۔"

غرض وہ مجھے ایک عالی شان بارہ دری میں لے گیا جہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی سب کے سب کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں ہاتھ لیجا کر مسند پر بٹھایا۔ قاضی جی نے خطبہ پڑھا اور شہزادی زارا کے ساتھ میرا عقد باندھ دیا۔ میں شہزادوں کی مانند رہنے لگا۔ میری شہزادی زارا نہایت ہی حسین، لائق، سلیقہ شعار اور خدمت گزار تھی۔ میرے آرام کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی۔ غرض میرے لیئے دن عید رات شب برات تھی۔ ہر طرح کا آرام و اطمینان تھا۔ مگر یہ خیال دن رات میں کئی دفعہ دماغ میں آ آکر پریشان کرتا تھا کہ خبر نہیں میرے بیوی بچّوں پر کیا گذر رہی ہوگی اور میرے عزیز و اقارب مجھے کیا سمجھتے ہوں گے۔ شہزادہ سالار کو مجھ سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اُسے ہاتھی، شیر اور گینڈے کے شکار سے خاص رغبت تھی۔ میرا تو شیر کی دہاڑ ہی سُنکر خون خشک ہوتا تھا اور مچان پر بیٹھا ہوا کانپا کرتا تھا۔ مگر وہ دلاور ہمیشہ خنجر یا تلوار سے شکار کرتا تھا۔ جہاں شیر کی آواز سُنی اور باغ باغ ہو گیا۔ اِس جھاڑی میں جا گھسا، اُس جھاڑی میں ڈھونڈ رہا ہے۔ اِس غار میں چلا گیا، اُس چشمہ پر جا پہنچا۔ غرض وہ اپنے شکار کی جستجو میں بے چین رہتا تھا۔ جہاں شیر سامنے دکھائی دیا اور یہ جست مار کے کُودا اور للکارا۔ شیر منہ پھاڑ کر اگلے پاؤں اُٹھا کر اس پر لپکا کہ دم زدن میں فنا کر دے۔ اُسنے ایک ہاتھ جس پر پہلے ہی سے کپڑا لپیٹ رکھا تھا اُس کے منہ میں دیا اور جھٹ دُوسرے سے خنجر سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ انتڑیاں نکل پڑیں اور شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مَیں شہزادے کے ساتھ بیسیوں دفعہ شکار کو گیا اور جب گیا اُس کے لیئے دست بدعا گیا اور جب واپس آیا اُس کی شہ زوری، بہادری اور جوانمردی کی تعریف کرتا آیا۔

مجھے وہاں عیش و آرام کے ساتھ رہتے کوئی آٹھ مہینے ہوئے ہوں گے کہ ایکدن شہزادہ سالار میرے پاس آیا اور کہا "بھائی جان آج صبح سے طبیعت گھبرا رہی ہے، کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ چلئے شکار کو چلیں۔ شاید وہیں دل بہل جائے" مجھے سالار سے کچھ ایسی محبت ہوگئی تھی جیسے اپنے سگے بھائی سے ہوتی ہے۔ میرا دل تو بھلا ایسے شکار سے کیا بہلتا مگر اُس کی خاطر سے تیار ہوگیا۔ میں حسب معمول مچان پر بیٹھ گیا۔ چار آدمی اور بھی بندوقیں لئے بیٹھے تھے۔ شہزادہ اُسی طرح جھاڑیوں میں پھرنے لگا۔ یکایک شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ شہزادے نے حسب معمول ایک ہاتھ شیر کے منہ میں دیا اور دوسرے سے خنجر اُس کے پیٹ میں بھونک دیا۔ مگر اُسی وقت ایک شیرنی دہاڑ مار کر پیچھے کی طرف سے شہزادے پر آپڑی۔ ہم پانچوں آدمیوں نے مچان پر سے ایک دم فیر کئے۔ شیرنی گر پڑی۔ شہزادہ بھی گر پڑا۔ اُتر کر دیکھا تو دونوں شیروں کے بیچ میں میرا شیر بھی پڑا اپنے خون میں غوطے کھا رہا ہے۔ شیرنی مرنے سے پہلے ہی اُس کا کام تمام کر چکی تھی۔

اِس سانحۂ ہوش رُبا کا سب پر بُرا اثر پڑا۔ بادشاہ کے دل پر تو ایسا دھا کہ بیٹھا کہ اُسی دن بیمار ہوگیا۔ شہزادی زارا نے روتے روتے بُرا حال کر لیا مجھے بھی شہزادے کی بے وقت موت سے بڑا صدمہ ہوا۔ ہر وقت اُس کی صحبت کا خیال آتا اور اُس کی موت کا سماں نظروں کے سامنے آتے ہی دل ڈوبا سا جاتا۔ بادشاہ بائیس دن بیمار رہ کر راہیٔ ملک عدم ہوا۔ سلطنت میں تہلکہ مچ گیا۔ قیامت برپا ہوگئی۔ مختصر یہ کہ ایامِ سوگ

گذرنے کے بعد اُمراء وزراء نے مجھے تخت پر بٹھا دیا۔ میں نے آٹھ سال تک حکومت کی۔ اس عرصہ میں شہزادی زارا کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی

ایک دن علی الصباح کشتی میں بیٹھ کر سیر کرنے گیا۔ اتفاقاً کچھ خیال آگیا کہ ایک دن والدِ مرحوم سے یوں ہی باتوں باتوں میں کچھ ذکر آگیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں تو یہ کروں وہ کروں۔ پھر والدِ مرحوم کی شفقت و مہربانی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی اپنی ملازمت پھر شادی اور بال بچّوں کا ہونا۔ یکے بعد دیگرے یہ سارے خیالات کچھ اس طرح آتے گئے کہ مجھے خبر نہ رہی کہ کشتی کدھر جا رہی ہے۔ یکایک پانی کے زور شور سے اُچھلنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو کشتی سمندر میں تھی۔ سمندر میں پہنچتے ہی ایسے زور کا طوفان آیا کہ ملّاح پریشان ہو گئے۔ میں نے حکم دیا کہ کشتی واپس لے چلو۔ مگر ہوا کے جھکڑ اور پانی کے تھپیڑوں نے آناً فاناً میں کشتی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہوائی جہاز ہے جو سَو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی اور شہزادی زارا کی محبت، اپنے تینوں بچّوں کی پیاری پیاری صورتیں، شہزادے کا شیر کے شکار میں ہلاک ہونا، بادشاہ کی موت، اپنا بادشاہ بننا۔ سارے واقعات یکے بعد دیگرے سامنے آگئے۔ بس یہاں تک تو مجھے یاد ہے۔ اس کے بعد میں بیہوش ہو گیا۔ پھر خبر نہیں کیا ہوا۔ جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ دریا کے کنارے پڑا ہوں اور ایک ستار اور چند کتابیں کپڑے میں بندھی ہوئی پاس رکھی ہیں۔ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ دریائے جمنا کا پانی آہستہ

آہستہ بہہ رہا تھا۔ سامنے لال قلعہ اور زینت المساجد کے مینار اور برج دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دھوبی اپنے بیل پر کپڑے لادے لئے جا رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاس جا کر کہا کہ بھائی ذرا میری کتابیں گھر تک پہنچا دے۔ اُس نے کہا ایک روپیہ دِلوا دیئے پہنچا دیتا ہوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ تین روپے پڑے ہیں۔

معزز حاضرین! میں یہ کہنا بھول گیا کہ جس دن میں غائب ہوا تھا میری جیب میں تین روپے تھے۔ وہی تین روپے اِس وقت موجود تھے اور وہی اُسی دن والے کپڑے میرے جسم پر تھے۔ غرض میں نے ایک روپیہ دھوبی کو دیا اور گھر پہنچا۔ گھر میں گھستے ہی بچے ابّا ابّا کہکر چمٹ گئے۔ بیوی بھی باورچی خانہ میں سے بولیں "آج دِن بھر کہاں رہے۔ آدمی جائے تو کہکر تو جائے کہ آج دعوت ہے میرا انتظار نہ کرنا واہ خوب رہے!"

اپنے پُرانے گھر کو دیکھکر جس میں نو برس کے بعد آنا ہوا اور بیوی بچّوں کو دیکھکر خوشی بھی ہوئی اور اپنی سلطنت اور شہزادی نارا اور تینوں پیارے پیارے بچّوں کو کھو کر رنج بھی ہوا۔ اُس وقت رنج اور خوشی کے ملنے سے کچھ ایسا دل بے قابو ہوا کہ بے اختیار چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ بیوی گھبرائی ہوئی آئیں اور حال پوچھنے لگیں۔ چھوٹی لڑکی چھاتی سے لپٹ گئی۔ بڑا لڑکا سر دبانے لگا۔ بیوی نے پانی لاکر پلایا۔ میں نے کہا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لاؤ۔ کھانا کھایا

پانی پیا اور ذرا حواس درست ہوئے تو مختصر طور پر اپنا قصہ بیوی کو سنایا۔ انہوں نے ہنسکر کہا کہ میں سمجھ گئی۔ آپ نے کسی دوست کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا ہوگا۔ انہوں نے بھنگ ونگ کھلادی ہوگی۔ بس یہ سارا فساد اُسی کا ہے۔

میں نے بیوی سے بحث کرنی مناسب نہ سمجھی، چُپکا ہوگیا۔ مگر اُس دن سے آج تک کریدنی سی لگی ہوئی ہے۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے اپنی بادشاہت کا خیال لگا رہتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن واقعات کو کیا سمجھوں اور کیا خیال کروں۔

یہ ہے میری سرگذشت۔ آپ بھی اِس بارے میں میری بیوی کے ہمخیال ہوں گے کہ کسی نے بھنگ کی مٹھائی کھلادی ہوگی۔ مگر برائے مہربانی کوئی رائے قائم نہ کیجئے پہلے مجھے ثبوت پیش کر لینے دیجئے۔

اوّل یہ کہ مجھے کبھی دس بیس آدمیوں کے سامنے بھی تقریر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اِس جلسہ میں میرے دفتر کے بیسیوں دوست موجود ہیں جو میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ آج میں اِس بھرے مجمع میں تقریر کر رہا ہوں اور بغیر کسی حجاب یا لکنت کے۔ آپ شاید اِسے معمولی بات سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو شخص پہلے کبھی پلیٹ فارم پر نہ آیا ہو مسلسل تقریر کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں بارہا ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں تقریریں کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بغیر رُکے بغیر اٹکے اِس طرح اِتنی دیر سے تقریر کر رہا ہوں۔

دوم یہ کہ میرے دوست جانتے ہیں کہ مجھے گانا بجانا مطلق نہیں آتا تھا صرف سیدھی سادی غزلیں بچوں کی طرح گا لیتا تھا۔ ہاں شوق بہت تھا۔ میں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں موسیقی کے متعدد اُستاد اور ماہرینِ فن مقرر کئے تھے جو مجھے گانا بجانا سکھاتے تھے۔ پورے پانچ سال تک میں نے علم موسیقی اُن سے سیکھا اور اُس میں کمال حاصل کیا۔ یہ دیکھئے وہی ستار ہے جس کا ذکر اُوپر کر چکا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ ہندوستان کے ستاروں سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے یہاں کے ستاروں میں پردے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے مضراب چلاتے ہیں دوسرے سے تاروں پر انگلیاں رکھکر مختلف پردوں کے اُوپر ہاتھ دوڑاتے ہیں۔ مختلف پردوں پر تار کے آنے اور دبنے سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور راگ راگنیوں کی شکل بنتی ہے اب ذرا اِس ستار کو دیکھئے۔ صنّاعی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اوّل تو آبنوس کی لکڑی ہے دوم کام نہایت باریک اور عمدہ کیا ہوا ہے۔ سوم تار لوہے یا پیتل کے نہیں ہیں بلکہ ایک خاص دھات کے ہیں جو غالباً یہاں کسی نے نہیں دیکھی۔ شاید مبصّرین بتا سکتے ہوں کہ کیا ہے۔ ان تاروں کو کسنے یا ڈھیلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ چہارم اِس میں خاص صنعت یہ ہے کہ تاروں پر ہاتھ رکھنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ دیکھئے برابر برابر سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں پر اُسی دھات کے پتّرے لگے ہوئے ہیں۔ بس ان پتّروں پر انگلیاں مارتے جائیے مختلف جگہ انگلیاں مارنے سے مختلف پردوں کے تار دبیں گے اور مختلف آوازیں پیدا ہوں گی۔ ہاں مضراب اپنی جگہ پر ضرور چلاتے جائیے۔

میں راگ راگنیوں سے پورا واقف ہو گیا ہوں جن صاحب کا جی چاہے یہاں تشریف لاکر میرا امتحان کرلیں۔ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اصل گانا وہ ہے جسے سُن کر انسان مدہوش ہو جائے۔ اگر یہ نہیں تو وہ گانا نہیں فقط دِل بہلانا ہے میں نے پانچ سال محنت کر کے موسیقی میں کمال پیدا کیا ہے۔ آپ بھی سُنیئے اور داد دیجیے۔

یہ کہکر قاضی صاحب کُرسی پر بیٹھ گئے اور سِتار لے کر بجانا شروع کیا۔ ایک منٹ کے بعد سنّاٹا چھا گیا۔ یہ حالت ہوئی کہ بچّہ بھی بولے تو اُس کی آواز اِس سِرے سے اُس سِرے تک سب کو سُنائی دے۔ پانچ چھ ہی منٹ کے بعد لوگ ایسے وجد میں آئے کہ کوئی پاؤں چلانے لگا، کوئی چُٹکیوں سے تال دینے لگا۔ کوئی سر ہلانے لگا۔

قاضی صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد سِتار بند کیا اور چُپ چاپ سیر دیکھنے لگے۔ کوئی ایک منٹ تک تو لوگ اِسی حالتِ وجد میں رہے۔ پھر ہوش آیا تو دیکھا کہ قاضی صاحب بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ واہ وا۔ سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ مرحبا کا غل مچ گیا۔ قاضی صاحب نے سِتار لے کر ایک ٹھمری دھرپت میں خدا کی شان میں شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ خدا سامنے موجود ہے اور بندہ ہاتھ باندھے

اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ قاضی صاحب کی پاٹ دار آواز اُس پر ستم یہہ کہ غضب کا رس اور پھر اُتار چڑھاؤ، باریکیاں اور نکات۔ لوگ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے قاضی صاحب نے گانا ختم کیا۔ مگر دو تین منٹ تک لوگوں پر رقت طاری رہی۔ پھر قاضی صاحب نے ملہار چھیڑا "رُت برکھا کی آئی"۔ اہاہا۔ معلوم ہوا کہ ساون کی بھیگی بھیگی ہوا چل رہی ہے۔ کالی کالی گھٹائیں آرہی ہیں۔ باغ میں کھڑے ہیں۔ چھما چھم مینہ پڑ رہا ہے لوگوں کے دل باغ باغ ہو گئے۔ قاضی صاحب نے یہ راگ بھی ختم کر کے کہا۔ حضرات دیپک راگ کا آپ نے نام ہی نام سُنا ہوگا۔ لیجیئے آج اپنے کانوں سے سُن لیجئے۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ دیپک کے سُروں سے آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے میں کہیں کہیں ایک آدھ سُر دیپک کا لگا جاؤں گا۔ اُسی سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔

یہ کہکر قاضی صاحب نے پھر گانا شروع کیا۔ لوگ بڑی توجہ اور اشتیاق سے سُن رہے تھے۔ یکایک گھبراہٹ سی پیدا ہوئی۔ کسی نے اچکن کے بٹن کھول دیئے کوئی گلا سہلانے لگا۔ کسی نے پسلیوں کو سہلایا۔ کوئی زور سے اُف کر کے رہگیا۔ قاضی صاحب مُسکراتے رہے اور گاتے رہے۔ دو تین دفعہ یہی حالت ہوئی۔ قاضی صاحب نے گانا ختم کر کے کہا

"اب فرمایئے! مجھ جیسے شخص کے لئے جو دن بھر دفتر میں کولھو کے بیل

کی طرح جُتا رہے۔ اور گھر میں آکر نون تیل لکڑی کی فکر میں لگ جائے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ موسیقی میں وہ کمال پیدا کرے جو آج ہندوستان میں تو کیا شاید دنیا میں کسی کو حاصل نہ ہوگا۔ اب بھی آپ میرے واقعات کو خواب سمجھیں گے؟

سوم۔ یہ کہ میں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں حکمت بھی سیکھی تھی آیئے جن صاحب کو منظور ہو ہمیں اسی وقت امتحان کر لیجئے۔ میں نبض پر ہاتھ رکھکر بتا دوں گا کہ کیا مرض ہے اور اگر آپ چاہیں گے تو نسخہ بھی لکھدوں گا۔

چہارم۔ یہ کہ جب میں مدرسہ میں پڑھتا تھا تو اکثر فٹ بال اور کرکٹ کھیل لیا کرتا تھا مگر پولو کھیلنا تو درکنار گھوڑے پر چڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ اب مَیں پولو میں برق ہوں۔ پورا شہ سوار ہوں۔ ننگی پیٹھ پر بغیر کاٹھی یا زین کے بیٹھکر کوسوں سرپٹ دوڑا سکتا ہوں۔

پنجم یہ کہ میں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں بڑے بڑے علماء سے تعلیم حاصل کی اور ڈھائی سال لگاتار محنت کرکے ایک کتاب "المخلوق موسوم بہ التشریح کن فیکون" لکھی جس کی آٹھ جلدیں ہیں اور ہر جلد کم وبیش پانچسو صفحے کی ہے۔

جلد اول انسان، جلد دوم حیوانات، جلد سوم نباتات، جلد چہارم جمادات،

جلد پنجم حشرات الارض، جلد ششم کرۂ ہوائی، جلد ہفتم اجرام فلکی، جلد ہشتم طبقات خزائن الارض۔ یہ ساری جلدیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ یہ سب میری اپنی تصنیف کردہ ہیں۔ باور نہ ہو تو کوئی سی جلد اُٹھا لیجئے اور پوچھتے جائیے۔ میں آپ کو بتاتا جاؤں گا۔

اب خدا کے لئے ذرا خیال تو کیجئے۔ اگر میری سرگزشت محض خواب ہوتی یا بھنگ کا اثر ہوتا تو مجھے ایک دن میں ایک دم سے اتنے سارے علوم پر عبورِ کامل کیسے ہو جاتا جن میں سے ہر ایک کے حاصل کرنے کے لئے وقت، روپیہ، حکومت اور شوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے بادشاہت میں میسّر تھیں۔ اہلِ کمال موجود تھے، طاقت تھی، روپیہ تھا، حکومت تھی، شوق تھا سارے کمالات حاصل ہو گئے۔ ذرا غور تو کیجئے چار ہزار صفحوں کی کتابیں بھلا ایک دن میں لکھی جا سکتی ہیں اور لطف یہ کہ چھپی ہوئی مجلّد۔ کتنے دنوں میں مسودہ ہوا ہوگا، کتنی دفعہ نظرِثانی کی ہوگی، کتنے عرصے میں چھپی ہوں گی۔

بتائیے اب بھی آپ اسے خواب کہیں گے اور اگر خواب نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

یہ کہکر قاضی صاحب بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب کی بات سچ نکلی۔ سب ایکدم سے

کا منہ تکنے لگے اور کچھ جواب بن نہ آیا۔ میری بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔ سوائے اِس کے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اللہ پاک قادرِ مطلق ہے جہاں وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے چاند۔ سورج۔ ستارے، اور سیّاروں کو دن رات چلاتا پھراتا رہتا ہے اور ایک کو دوسرے سے ٹکرانے نہیں دیتا۔ جہاں اُس نے انسان جیسی چیز بنا ڈالی اور ایک انسان کیا ہر وہ چیز جسے انسان دیکھ سکا یا معلوم کر سکا یا محسوس کر سکا، ایسی ہے جسے انسان خود نہیں بنا سکتا۔ پس ایسی طاقت، قوت اور قدرت والے اللہ کو وقت اور جگہ پر بھی پورا قبضہ و اقتدار حاصل ہے۔ چاہے جب اور جسے گھٹا دے یا بڑھا دے۔ جل شانہٗ

(مطبوعہ "شبابِ اُردو" جنوری ۱۹۲۵ء)

دوچشم دید واقعات

(۱)

اسی سال کا واقعہ ہے۔ تاریخ اور دن تو کسے یاد رہتا ہے۔ گرمی کا موسم مئی کا[ضمیمہ]
تھا۔ صبح کے نو بجے ہوں گے۔ میں جامع مسجد سے گھر کی طرف آرہا تھا۔ چاوڑی بازار میں کیا
دیکھتا ہوں کہ دس بارہ آدمی کھڑے ہوئے ایک کوٹھے کی طرف بڑے غور سے دیکھ
رہے ہیں۔ کچھ طبع انسانی کا خاصہ ہے، اور دہلی میں تو بھیڑ چال مشہور ہی ہے۔ ہر جلد
سے گذرو روز ہی دیکھ لو۔ دس آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ بیس وہاں جمع ہیں اور
بات دراصل کچھ نہیں۔ کہیں تانگے والے سے سواریوں کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ کرائے
کی کمی بیشی پر حجت ہے، کسی تھرڈی والے کو سپاہی نے پکڑ لیا اور کچھ وصول
کرنا چاہتا ہے، کہیں دو شخصوں میں جوتی پیزار ہو رہی ہے۔ غرض کوئی غیر معمولی
بات نہیں ہوتی۔ لیکن لوگوں کو سکتے کے عالم میں دیکھ کر مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔ نظر
اُٹھا کر جو دیکھتا ہوں تو عجیب معاملہ نظر آیا۔ ایک بلّی کبوتر کو منہ میں دبائے کوٹھے پر سے
نیچے اتر کر سڑک کی دوسری طرف جانا چاہتی ہے۔ مگر نیچے آدمی کھڑے چلا رہے ہیں
اُترتی ہے پھر آدھی دُور سے پلٹ جاتی ہے۔ ہندو کھڑے "رام رام" کہہ رہے ہیں

لہ۔ وہ لوگ جو چھیبے (ٹوکرے) سر پر لئے بازاروں میں ترکاریاں پھل وغیرہ بیچتے پھرا کرتے ہیں۔

مسلمان کہہ رہے ہیں "اجی توبہ کرو۔ اب کہیں بچتا ہے۔ اُس کا تو جھٹکوں ہی میں دم نکل گیا ہوگا۔"

دو تین منٹ تک تو بلی یوں ہی بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ پھر ایک دفعہ ہی کوٹھے پر سے سائبان پر اور سائبان کی بلّی پر سے ہوتی ہوئی نیچے پٹڑی پر اور وہاں سے چھلانگ مار کر سڑک پر پہنچی۔ لوگ بھی "لینا لینا یہ گئی وہ رہی" کہتے ہوئے پیچھے بھاگے مگر بیچ میں ایک تانگہ آگیا جس کی وجہ سے رُکنا پڑا۔ تانگے والا تانگہ دوڑاتا ہوا چلدیا اُسے کیا خبر کہ اللہ تعالےٰ نے اِس وقت اُس کے تانگے کو ایک خاص کام کے واسطے بھیجا تھا۔ مظلوم کی رہائی اور ظالم کی موت کا تماشا اپنے بندوں کو دکھانا تھا۔ یہ سب آناً فاناً میں ہوگیا۔ اب جو دیکھا تو بلّی مری پڑی ہے اور کبوتر صاحب صحیح و سلامت تشریف لے گئے۔ اِس واقعہ سے سیدھے سادے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بدن میں پھُریریاں آئیں۔ اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ دل و دماغ پر سکہ جما گئی۔ دِلوں نے گواہی دی کہ زندگی اور موت کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ ع

جلی تھی تیغ کسی پر کسی کے آن لگی

جس نے پیدا کیا ہے وہی ہر وقت، ہر حالت میں اور ہر جگہ بچاتا بھی ہے کیسی سے کیسی سخت مصیبت کیوں نہ ہو۔ انسان کو خدائے لایزال کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہم جیسے کم تعلیمیافتہ آدمیوں کا اور اُن لوگوں

کا جو بے چارے تعلیم سے نابلد تھے یہ خیال تھا اور ہماری زبان سے "اللہ اکبر" اور "ہے بھگوان" کے نعرے نکل رہے تھے لیکن جنہیں اللہ نے تعلیم کی نعمت پیٹ بھر کر دی تھی وہ بے پرواہی سے کہہ رہے تھے "اجی اتفاق کی بات ہے محض اتفاق ہے"۔

سُنا آپ نے؟ بلّی کبوتر منہ میں لئے سڑک کی ایک طرف سے دوسری طرف جا رہی ہے۔ سڑک کچھ زیادہ چوڑی بھی نہیں ہے۔ یہی کوئی آٹھ دس گز ہوگی۔ عین اُسی وقت تانگہ آجاتا ہے۔ بلّی گھوڑے کی ٹاپوں سے تو صاف بچ جاتی ہے اور ایک پہیئے کو بھی پار کر جاتی ہے لیکن دوسرا پہیہ ٹھیک اُس کے گلے پر پھر جاتا ہے۔ اس طرح کہ بلّی کا مُنہ چر کے رہ جاتا ہے تاکہ دانت گرفت چھوڑ دیں اور کبوتر اُڑ جائے۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو جاتا ہے ایسا ارادی کام اور قدرتی انتظام ہمارے ارباب بصیرت کو ایک معمولی واقعہ اور اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار

(۲)

برسات کا موسم تھا۔ رات کو بوندا باندی کی وجہ سے چھت پر سے کمرے میں اور کمرے میں سے چھت پر تانا بانا تنتا رہا۔ خوب نیند خراب ہوئی۔ صبح ہوتے ذرا آنکھ لگی تھی۔ کمرے میں سو رہا تھا۔ گلی کے رُخ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی

تھیں۔ کوئی پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ دُھوپ اُس وقت تک نہیں نکلی تھی۔ ایکا ایکی ایسے زور کا دھماکا ہوا کہ چونک پڑا۔ گھبرا کر جو اُٹھا تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے۔ جب لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آئیں تو ننگے سر، پاؤں میں سلیپر ڈال کر بھاگا۔ ہمارے مکان سے ایک گھر بیچ گیندا تیلی کا مکان ہے جو اس وقت بہت بوسیدہ ہو رہا تھا۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ ملبے کا ڈھیر ہے اور بہت سے آدمی اُس کے پاس کھڑے کہہ رہے ہیں "ارے بھئی دو تھے۔ یہیں دب گئے" میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی کیا بات ہے۔ کیا معاملہ ہے؟ اُس نے کہا میاں اِس گھر کے اور آدمی تو کہیں شادی بیاہ میں گئے ہوئے ہیں۔ ایک غریب پنہاری یہاں نیچے کی کوٹھڑی میں رہتی ہے اور رات کو اوپر کی کوٹھڑی میں اپنے دونوں بچوں کو لیکر پڑ رہتی ہے۔ وہ تو اس وقت کہیں گئی ہوئی ہے بچے اُوپر کی کوٹھڑی میں سو رہے تھے۔ اب اِسی ملبے کے نیچے دبے پڑے ہوں گے۔

اِتنے میں کسی نے پنہاری کو بھی خبر کردی۔ وہ بےچاری ممتا کی ماری پیٹ پکڑے آئی اور کلیجے پر دونوں ہاتھوں سے گھونسے مار کر اُسی ملبے پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اکثر لوگوں کے ہاں ایک آدھ کُدال پھاوڑا پڑا رہتا ہے کہ خبر نہیں کب کیسی ضرورت پڑ جائے تو خواہ مخواہ تھوڑے سے کام کے لئے کیوں مزدور بلائیں اپنے آپ ہی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک آدمی دوڑ کر کدال اور دوسرا پھاوڑا لے آیا۔

اور احتیاط سے کھودنا شروع کیا۔ جہاں بچوں کی ماں نے پتہ بتایا وہیں سے مٹی سرکانی شروع کی۔ کوئی ہاتھ بھر مٹی ہٹائی ہوگی کہ بچّے کی انگلی دکھائی دی بس جلدی جلدی مٹی ہٹا کر بچے کو دونوں ہاتھوں سے اُبھار کر کندھوں سے اونچا کر لیا۔ لوگ ٹوٹے پڑتے تھے کہ دیکھیں جیتا ہے یا مر گیا۔ کھُلی جگہ جا کر بچے کو زمین پر کھڑا کیا۔ ماں نے جلدی سے اُٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔ خدا کی قدرت کہیں ٹھیس تک نہیں لگی تھی۔ نہ کہیں سے بدن چھِلا تھا۔ ہاں آنکھوں میں مٹی تو بھر گئی تھی جنہیں وہ دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی مَل رہا تھا گویا ساری تکلیف اور پریشانی بس یہی تھی۔ یہ لڑکا کوئی تین برس کا ہوگا۔ ماں نے چلّا کر کہا۔ "ارے کوئی بھاگوان میرے دوسرے لعل کو بھی نکال دو۔"

اُسی جگہ سے پھر دو آدمیوں نے ہاتھوں سے مٹی سرکانی شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ہاتھ نکلا۔ بڑی احتیاط سے اِس بچے کو بھی نکال لیا۔ یہ دودھ پیتا تھا۔ جلدی سے ماں نے دودھ منہ سے لگا دیا۔ چُسر چُسر پینے لگا کہیں نام کو بھی چوٹ نہیں آئی تھی۔

اس وقت قدرتِ الٰہی کا کچھ ایسا رعب دلوں پر طاری ہوا کہ سب کے سب سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ کسی کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ پھر سب ہندو مسلمان اللہ پاک کی شانِ کبریائی کا ذِکر کرتے ہوئے گھروں کو واپس ہوئے۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی ایسا سانحہ نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تو یقین تھا کہ بچے ہرگز نہیں بچے ہونگے

بھلا جب دُھڑ اُوپر کی چھت کوٹھڑی کی چھت پر پڑی جہاں بچے سو رہے تھے اور وہاں کی دیواروں، کڑیوں، تختوں اور اینٹ مٹی کو لے کر نیچے آئی تو ایسی حالت میں کون کہہ سکتا تھا کہ بچوں کی ہڈّی پسلی سلامت رہی ہوگی۔ اِس پر طُرّہ یہ کہ مَنوں مٹی کے نیچے پانچ چھ منٹ تک وہ دَبے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ پاک جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور اِس طرح کرتا ہے کہ خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ مگر

کسے زچون و چرا دَم نمے تواند زد
کہ نقش بند حوادث ورائے چون و چراست

(مطبوعہ "تہذیب نسواں" اکتوبر ۱۹۲۲ء)

پاگل

آج راجہ رام سنگھ بہت خوش ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ بات بات پر مسکرائے دیتے ہیں۔ کہنے کو تو رام گڑھ چھوٹی سی ریاست ہے بلکہ اُسے ریاست کہنا بھی بجا نہیں۔ چھوٹا سا علاقہ ہے۔ مگر راجہ رام سنگھ کا دل بہت بڑا ہے رام گڑھ میں گھر گھر عید منائی جا رہی ہے۔ راجہ صاحب نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے۔ آج اِن کی ریاست میں ہر شخص رنج و غم سے آزاد ہے۔ ہر کس و ناکس کا فرض قرار دیا ہے کہ عیش و عشرت میں مصروف رہے۔ خزانے کا منہ کھول دیا ہے۔ روپیہ بے دریغ اُٹھایا نہیں لنڈھایا جا رہا ہے۔ دیکھنا بازاروں میں کیا چہل پہل ہے اور تو اور سڑکوں پر بھی یار لوگوں نے فرش بچھا رکھے ہیں۔ گھوڑے گاڑی کے لئے ذرا سی پٹی چھوڑ کر باقی سب جگہ دریاں چاندنیاں بچھی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ ٹولیاں جمع ہیں۔ گانا بجانا اور ناچ رنگ ہو رہا ہے۔ آیئے آپ کو بتائیں کہ اس کی علتِ غائی کیا ہے؟ سُنیئے آج ہمارے مہاراج کے اکلوتے صاحبزادے راج کمار پرتاپ سنگھ چاند سی دُلہن بیاہ کر لائے ہیں۔

چندر کور حقیقت میں چاند کا ٹکڑا ہے۔ حُسن کی تعریف کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ ایسی چاند سی دُلہن سے کنور پرتاپ سنگھ کو محبت نہو تو آپ کو اختیارِ کُلّی حاصل ہے کہ آپ اُسے دیوانے کے معزز القاب سے یاد کریں۔ مگر ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ دیوانہ مشہور ہو۔ لہٰذا آپ یقین کریں کہ وہ اپنی دُلہن سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ حقیقی معنوں میں اُس کا پرستار ہے۔ اور ؎

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

کے زرّیں اصول نے اِن کی دُنیا کو جنّت بنا دیا ہے۔ یہ اُس کا دالہ وشیدا تو وہ اِس کی پرستار دلدادہ، یہ اُس کے لئے بیتاب تو وہ اِس کے لئے بیقرار، یہ اُس کا پروانہ تو وہ اِس کی شمع۔ غرض یہ مجنوں تو وہ لیلیٰ، یہ نل تو وہ دمینتی، یہ دامق تو وہ عذرا مبارک ہیں وہ ہستیاں جن کے دل بادۂ اُلفت سے سرشار ہیں اور جن کے سینوں میں بحرِ محبت پڑا لہریں مار رہا ہے۔

آہاہاہا! صبح سویرے کا وقت بھی کیسا سہانا اور دل کش ہوتا ہے۔ ہر چیز پر نُور برستا ہے۔ باغوں میں ہرے بھرے درختوں اور پھُولوں سے لدے ہوئے لہلہاتے ہوئے پَودوں کا تو ذِکر ہی کیا ہے۔ ببول کے درخت اور ناگ پھنی کے جُھنڈ بھی عجیب دِل کش معلوم ہوتے ہیں۔ عالی شان مسجدوں، مندروں اور خوش نُما عمارتوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ پُرانے کھنڈر اور پھُونس کی جھونپڑیاں

بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں. شام کے وقت لوگ کہتے ہیں. ع

مریضِ عشق اُٹھ بیٹھو کہ دونوں وقت ملتے ہیں

دونوں وقت یعنی صبح اور شام ملتے تو ہیں مگر صورت میں. سیرت میں نہیں. بھلا آپ ہی بتایئے دن بھر کی تپی ہوئی زمین، دن بھر کی پٹی کُٹی زمین شام کو اپنے جلے پھپھولے پھوڑتی ہے یا نہیں. اپنے دل کا بخار اُس وقت نکالتی ہے یا نہیں. بازاروں میں غل غپاڑہ، تانگوں کی گڑگڑاہٹ، موٹروں کی پوں پوں. لوگوں کی چیخ پکار ایک بات ہو تو بیان کی جائے. باغوں میں اُس وقت گو بازاروں سے بہتر حالت ہوتی ہے اور جنگل بھی نسبتاً بھلے معلوم ہوتے ہیں. ع "مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی". صبح نور کے تڑکے جہاں جاؤ ع "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

ہاں تو صبح سویرے ایسی جگہ یعنی رام گڑھ کی جھیل کے کنارے جہاں ع "کسے را با کسے کارے نباشد" کا مضمون ہونا چاہیئے تھا. ع "ایں چہ شور است کہ در دَورِ قمر می بینم" کا مضمون کیسے ہو رہا ہے. ذرا دیکھنا یہ تلواروں کی جھنکار کیسی ہے. اوہو یہ تو جنگ باقاعدہ معلوم ہوتی ہے مگر مقابلہ برابر کا نہیں ہے اِس لئے کہ ایک طرف تو ایک تنِ واحد ہے اور دوسری طرف آٹھ دس آدمی ہیں سب کے سب گھوڑوں پر سوار. ارے...... رے...... رے...... وہ دیکھو ظالم نے بیچارے کے گھوڑے کی ٹانگ کاٹ دی. مگر سوار بھی غضب کا

پھرتیلا ہے۔ جھٹ کود کر الگ ہوگیا اور پینترا بدل کر کھڑا ہوگیا۔ آہا ہا! کس صفائی سے وار روک رہا ہے اور ایک اکیلا سب کو جواب دے رہا ہے۔ مگر مثل مشہور ہے کہ ایک کی دوا دو۔ یہاں تو ایک کے مقابلہ میں دس ہیں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی اکیلا چنا بھاڑ تو کیا خاک پھوڑتا خود ہی بھن کر رہ گیا۔ وہ دیکھئے لوگوں نے پکڑ دھکڑ کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ ابھی وہ اس نیک کام سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ "ٹھہر جاؤ بدمعاشو!" کی دل ہلا دینے والی آواز نے سب کو ایک جانب متوجہ کر دیا۔ دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت اور وجیہ شخص گھوڑے پر سوار، ننگی تلوار لیئے بپھرے ہوئے شیر کی مانند گرجتا۔ دہاڑتا چلا آتا ہے۔ اب پہلے سے بھی زیادہ خوفناک لڑائی شروع ہوئی۔ بدمقابل کے آدمی گرنے شروع ہوئے اور انہیں معلوم ہوگیا کہ انسان سے نہیں اجل سے مقابلہ ہے۔ آناً فاناً میں وہی پرانا داؤں یہاں بھی رواں ہوا۔ یعنی ایک ظالم نے پیچھے سے آکر گھوڑے کی ٹانگ سونت دی۔ تھوڑی دیر تک اور لڑائی جاری رہی۔ پھر کثرت نے قلت پر غلبہ پالیا اور اور یہ بھی پہلے کی طرح بندھ گیا۔ یہ لوگ جو بظاہر ڈاکو معلوم ہوتے تھے دونوں قیدیوں کو باندھ کر لے چلے۔

ایک کمرے میں دو قیدی بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ پہلا دوسرے کو ایسی نظر سے دیکھ رہا ہے جس سے تعریف اور شکریہ ٹپکا پڑتا ہے۔ دوسرا پہلے کو ایسی نظر

سے دیکھتا ہے جس میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کچھ دیر تک تو یونہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر پہلے قیدی نے کہا۔

پہلا۔ مجھے افسوس ہے اور بیحد شرمساری ہے کہ آپ میرے کارن مصیبت میں پھنس گئے

دوسرا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے اور بیحد شرمساری ہے کہ آپ کو مصیبت سے چھڑانے کی بجائے خود بھی قید ہو گیا جس کی وجہ سے آپ تو جو کچھ خیال کریں بجا ہے۔ میں خود اپنی نامردی اور بزدلی کا اعتراف کرتا ہوں اور نہایت شرمسار ہوں۔

پہلا۔ (جلدی سے) ہائیں۔ ہائیں! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کی بہادری اور دلیری میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے آپ کی چابکدستی اور ہنرمندی دیکھ دیکھ کر عش عش کر رہا تھا۔ کاش کہ میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو ہم دونوں یقیناً بیس پر بھی بھاری پڑتے۔ افسوس آپ میری وجہ سے گرفتار ہوئے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟

دوسرا۔ یہاں چونکہ ہم دونوں اکیلے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ پہلے آپ ہی اپنی تعریف فرمائیں۔

پہلا۔ میں رام گڑھ کے راجہ کالز کا کنور پرتاپ سنگھ ہوں۔ حسب معمول منہ اندھیرے سیر کے لئے نکلا تھا جھیل پر پہنچا تو اچانک آٹھ دس آدمیوں نے حملہ کر دیا اور مجھے باندھ کر لے جانے کو تھے کہ آپ آ گئے۔

دوسرا۔ کنورجی! معاف کیجئے گا میں اُٹھ نہیں سکتا مجبور ہوں۔ یہیں سے آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

پرتاپ سنگھ۔ ہائیں! یہ کیا فرماتے ہیں؟ تعظیم رعیت کرتی ہے اپنے راجہ کی۔ آپ میری رعیت نہیں ہیں بھائی ہیں اور بھائی بھی حقیقی سے زیادہ۔ میں جب تک جیوں گا آپ کی انسانیت، ہمدردی اور بہادری کا ممنون رہوں گا۔ اب مہربانی کر کے آپ اپنے نام سے مطلع فرمائیے۔

دوسرا۔ میرا نام جسونت سنگھ ہے۔ فی الحال اپنے باپ کا نام اور جائے سکونت نہیں بتا سکتا۔ فقط اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ میرے باپ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ میری ماں نے ایک راجہ صاحب سے شادی کر لی۔ میں اُس وقت صغیر سن تھا۔ عرصہ تک محل میں رہتا رہا اور اپنی ہم عمر سوتیلی بہن کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصہ سے میرا سوتیلا باپ میرا دشمن ہو گیا ہے بلکہ میری جان کا خواہاں ہے۔ میں اُس مُوذی سے بچنے کے لئے چھپا چھپا پھرتا ہوں۔ اب محض اپنی سوتیلی بہن سے ملنے جا رہا جا رہا تھا کہ ایک دفعہ اور اُسے دیکھ لوں۔ پھر جہاں قسمت لے جائیگی چلا جاؤنگا کہ یہ اُفتاد پڑی اور ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنس گیا۔

پرتاپ سنگھ کو جسونت سنگھ کا حال معلوم کر کے بڑا رنج ہوا۔ اُس نے اُس کی سوتیلی بہن کا نام پوچھا مگر جسونت سنگھ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی نہیں بتا سکتا۔

پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ اتنے میں دو آدمی کمرے میں ننگی تلواریں لئے ہوئے آئے ایک پرتاپ سنگھ کے پاس اور دوسرا جسونت سنگھ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ پھر دو آدمی اور آئے جن کے پیچھے نوکر کچھ ناشتے کا سامان لئے ہوئے آیا۔ دونوں قیدیوں کا ایک ایک ہاتھ کھول دیا گیا اور یوں اُن کو ناشتہ کروا کر پھر دونوں کے ہاتھ اُسی طرح باندھ کر چل دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکوؤں کا سردار کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔

سردار۔ کنورجی! معاف کیجئے گا۔ ہم سب آپ کی رعیت ہیں اور فرمانبردار مگر آپ کے پتاجی یعنی راجہ صاحب نے ہمارے اوپر بڑے بڑے ظلم و ستم کئے ہیں پچھلی دفعہ جس نوجوان کو پھانسی دی گئی تھی وہ میرا لختِ جگر تھا۔ اب مدتوں کے بعد اپنے بچے کا بدلہ لوں گا۔ کل شام کو آپ کا سر تحفہ کے طور پر آپ کے پتاجی کے پاس بھیجدوں گا تاکہ وہ سمجھ لیں اور جان جائیں کہ غریبوں کے پاس بھی دل ہوا کرتا ہے اور نوجوان بیٹے کی موت اُس دِل میں بھی تلاطم برپا کر دیتی ہے۔

یہ کہکر سردار نے غصے سے کنور کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے سُنے فوراً چلدیا۔ اُس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک دونوں سنّاٹے میں رہے۔ پھر جسونت سنگھ بولا۔

جسونت سنگھ۔ یہ ڈاکوؤں کا سردار تو کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیسا لڑکا اور

کیسی پھانسی، یہ قصہ کیا ہے؟"

پرتاپ سنگھ:۔ میں خود حیران ہوں کہ ماجرا کیا ہے۔ ہاں پچھلے دنوں پھانسی تو ایک ڈاکو کو ضرور ملی تھی۔

جسونت سنگھ:۔ تو وہ اس کمبخت کا بیٹا ہی ہوگا۔ ہمیں آج ہی رات کو آزادی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ ورنہ شاید دوسری شب نصیب نہ ہو۔

پرتاپ سنگھ:۔ مگر کیا کریں۔ دونوں بری طرح سے بندھے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہاتھ پاؤں کھلنے چاہیئں پھر کچھ دیکھا بھالا جائے

جسونت سنگھ:۔ خیر رات تو ہونے دیجئے۔ زندگی ہے تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی، اور جو دن ہی پورے ہو چکے ہیں تو پرماتما کی مرضی۔

دوپہر کا کھانا قیدیوں کو صبح کی طرح ہاتھ کھول کر کھلایا گیا اور اسی طرح رات کا بھی۔ طاق میں ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ کوئی گیارہ بجے جسونت سنگھ کھسکتا ہوا پرتاپ سنگھ کے قریب آگیا اور اُس کے کان کے پاس منہ لگا کر آہستہ سے کہا:۔

جسونت سنگھ:۔ کنور جی! میری اندر کی جیب میں ایک چھوٹا سا خنجر ہے جسے میں ہمیشہ چھپائے رکھتا ہوں، غنیمت ہے کہ ڈاکوؤں نے تلاشی نہیں لی۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر یہ موت اور زندگی کا سوال ہے۔ آپ دانتوں سے میرے کپڑے پھاڑ کر خنجر نکال لیجئے تو ابھی سب بندوبست

ہوا جاتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ اِس ترکیب سے لیٹ گیا کہ خنجر والا حصہ اوپر ہو گیا۔ کنور نے دانتوں سے کپڑے نوچنے شروع کئے۔ تھوڑی دیر میں خنجر نکل آیا۔ اُس کے دستے پر کنور نے پاؤں رکھا اور پھل کی دھار پر جسونت سنگھ نے ہاتھوں کی رسّی کو رگڑنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں رسی کٹ گئی۔ اب جسونت سنگھ کے ہاتھ آزاد تھے اُس نے ذرا سی دیر میں اپنی بندش کو کھول ڈالا۔ پھر کنور کی رسیاں کھولدیں۔ پھر اپنی اور کنور کی رسیوں کو جوڑ کر گرہ لگا دی۔ اس کے بعد کنور کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر جسونت سنگھ کھڑکی میں پہنچا وہاں رسّی کا ایک سِرا کنڈے میں مضبوط باندھا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر کنور کو اوپر کھینچا۔ دوسرا سِرا رسی کا نیچے لٹکا دیا۔ اوپر ماتما پر بھروسہ کر کے آہستہ آہستہ نیچے اُترنا شروع کیا۔ بارے رسّی کافی لمبی تھی خیریت کے ساتھ نیچے پہنچ گیا۔ رسّی کا اشارہ پاتے ہی کنور بھی اُترنے لگا۔ زمین پر پاؤں لگتے ہی کنور جوشِ محبت سے جسونت سنگھ کے لپٹ گیا جسونت سنگھ نے کہا کہ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ ہمیں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے فوراً چپ چاپ بھاگ چلیئے۔ چنانچہ دونوں اندھیرے میں بھاگے جا رہے تھے کہ پیچھے سے لالٹین کی مدھم روشنی دکھائی دی اور کچھ شور و غل کی آواز آنے لگی۔ اِن دونوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے جسونت سنگھ نے کہا کہ فوراً درخت پر چڑھ کر پتوں میں چھپ جائیے اور شاخ سے چُپ چاپ لپٹے رہیئے اور اُس

نے خود بھی ایسا ہی کیا۔ دو گھنٹے کے قریب یہ دونوں اسی طرح درخت سے لپٹے رہے۔ پھر ڈاکوؤں کی آواز آئی جو واپس ہو رہے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سردار کا چہرہ قابل دید تھا۔ غصے سے اپنے ہاتھ کاٹ رہا تھا اور کسی کے تھپڑ، کسی کے لات، کسی کے گھونسہ رسید کر رہا تھا۔

غرض جب اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں رہا تو یہ دونوں چپکے سے اترے اور احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے صبح کے قریب شہر میں پہنچ گئے۔

محل میں پہنچ کر کنور جی نے جسونت سنگھ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے اپنی بیوی چندر رکھا کے پاس جسونت سنگھ کو لے گیا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہنے لگا

"چندررا! انہیں پرنام کرو اور ان کے چرن چھوؤ۔"

چندر رکھا نے پرنام کیا اور جسونت سنگھ کے چرن چھوئے۔

کنور۔ یہ میرے حقیقی بھائی سے بھی زیادہ ہیں۔ انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کی اور مجھے مصیبت سے نجات دلائی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ موت کے چنگل سے رہائی دی۔ ورنہ آج شام کو اس محل میں میرا کٹا ہوا سر ہوتا اور ماتم برپا ہوتا۔

یہ کہہ کر سارے واقعات تفصیل کے ساتھ سنائے۔

جسونت سنگھ اب کنور جی کی ناک کا بال تھے۔ ایک محل رہنے کو ملا ہوا تھا ہر وقت ساتھ رہتے۔ سیر میں، شکار میں، ناچ میں، رنگ میں غرض ہر دم دم کے ساتھ تھے۔

ایک دن کنور جی سے کسی نے کچھ کہہ دیا، نہ معلوم کیا کہا۔ کنور جی ہنس کر چپکے ہو رہے۔ کہنے والا شرمندہ سا ہو کر چلا گیا۔ مگر کنور جی کو ذرا سا، کچھ ذرا سا خیال ہوا، جاتا رہا، پھر ہوا، پھر جاتا رہا۔ اب کنور جی کچھ چپ چپ سے رہنے لگے دل میں ایک پھانس سی لگ گئی جو ذرا ذرا سی دیر کے بعد کھٹکتی رہتی تھی۔

"یہ ناممکن ہے" کنور جی نے کہا "یہ ہو نہیں سکتا۔"

"ہو سب کچھ سکتا ہے" دل نے کہا "ایسی بہت سی باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں"۔

"تو ہم امتحان کئے لیتے ہیں" کنور جی نے کہا۔

"یہ بہت اچھا خیال ہے۔ دل نے کہا" بہت مناسب ہے"

آج کنور جی اپنی پھوپی سے ملنے "ٹیکرا" جا رہے ہیں۔ دو تین دن میں آجائیں گے جسونت سنگھ یہیں رہیں گے۔ وہ ٹیکرا جا کر کیا کریں گے۔ ایک دو دن کی بات تو ہے ہی۔

رات کے گیارہ بجے ہیں۔ کالے کمبل میں لپٹی لپٹائی کوئی ہستی احتیاط سے

قدم اٹھائے رانی چندر کور کے محل کے چور دروازے کی طرف جا رہی ہے۔ ایک تو وہ سنتری کو جا دبوچا۔ اب آگے بڑھی۔ غائب ہو گئی۔

چندر کور کے سونے کے کمرے میں رانی کے پلنگ پر جسونت سنگھ بیٹھا تھا۔ رانی لیٹی ہوئی تھی۔ اتنا نا ٹا میں کالا کمبل دروازے میں سے ہو کر سامنے آ کھڑا ہوا جسونت سنگھ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کالا کمبل الگ جا پڑا۔ کنور جی نے تلوار سونت کر جسونت سنگھ پر وار کر دیا۔ وہ ہائے کہکر گر پڑا۔ ادھر چندر کور بھی "ہائے بیرن" کہکر اس سے لپٹ گئی۔ کنور جی بہت سٹپٹائے اور گھبرا کر کہنے لگے۔

"بیرن؟ کون بیرن، کیسا بیرن؟

چندر کور۔ میرا بھائی! ہائے کنور جی تم نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔

کنور جی۔ کیسا بھائی؟

چندر کور۔ یہ میرا سوتیلا بھائی تھا۔ شاید اس نے تم سے اپنا حال بیان نہیں کیا۔

ہائے بھگوان یہ کیا ہوا؟

کنور جی۔ (کچھ سوچکر) سوتیلا بھائی؟ ہاں.......ہاں.......اس نے......

اس نے کہا تو تھا کہ اپنی سوتیلی بہن سے ملنے آیا ہوں مگر.....مگر.....تم

تم.....ہے بھگوان

کنور جی کو چکر آ گیا۔ سر تھام کر بیٹھ گئے۔

چندر کور:۔ ہائے بھگوان میں کیا کروں۔ ایک تو میرا بھائی مرا دوسرے میں بیوہ ہوئی۔

کنورجی:۔ (جلدی سے) بیوہ؟ بیوہ کیسے ہوگی؟

چندر کور:۔ کنورجی تم نہیں جانتے۔ تمہیں ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔ دیس گڈھ کے راجہ نے اس راج کے خلاف گورنمنٹ کے کان بھر رکھے ہیں بڑے مہاراج (کنور کے باپ) بڈھے ہو گئے ہیں۔ تمہارے سوا اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اب اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر دیس گڈھ کا راجہ تمہیں پکڑوا دیگا۔ خون چھپائے سے چھپ تھوڑا ہی سکتا ہے۔ تمہیں پھانسی ملے گی۔ بڑے مہاراج سے یہ صدمہ بھلا کاہے کو جھیلا جائے گا ریاست سرکار ضبط کرلے گی یا اس میں سے کچھ دیس گڈھ کے راجہ کو دے دیگی۔ ہائے میں کیا کروں۔ میں تو بیوہ بھی ہوئی اور راج پاٹ بھی گیا۔

یہ کہکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

کنورجی:۔ (گھبراکر) تو اب بتاؤ میں کیا کروں۔ جلدی جواب دو۔

چندر کور:۔ ہائے میں کیا جواب دوں۔ میری رائے میں اب تم کچھ عرصہ کے لئے چپ چاپ کہیں چلے جاؤ اور یہاں کی سُن گُن لیتے رہنا۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ اگر معاملہ دب گیا تو چلے آنا۔ ورنہ کیا

بتاؤں بڑی مشکل ہے۔

کنور اِس واقعہ سے کچھ ایسا بدحواس ہو گیا تھا کہ اُس کی عقل کام نہ کرتی تھی آخر رانی کی تدبیر پر عمل کرنے کی ٹھان لی اور اُلٹے پاؤں چور دروازے کی راہ سے باہر ہو گیا۔

بندھیاچل کی پہاڑ کی چوٹی پر کالی دیوی کا مندر ہے۔ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ ایک تو کالی ماتی کے درشن کو جاتری آتے ہی ہیں دوسرے اِس ہری بھری اور دِل فریب پہاڑی کا منظر ہی کچھ ایسا سُہانا اور دِل کش ہے کہ لوگ دُور دُور سے سیر کے لئے بھی آتے ہیں۔ یہاں کے مہنت جی بڑے خلیق اور خدا پرست ہیں ایک اپنے ہاتھ سے پرشاد تقسیم کرتے ہیں۔ اپاہجوں کو اپنے سامنے بھوجن کرواتے ہیں۔ دُکھ بیماری کا علاج جنگلی جڑی بُوٹیوں سے کرتے ہیں۔ غرض اُن مسافروں سیاّحوں، سنیاسیوں اور سادھوؤں کے لئے جن کا یہاں ہر دم تانتا لگا رہتا ہے مہنت جی کا وجود نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

آئیے ہم آپ کو ایک چیز دکھائیں۔ وہ دیکھئے وہ سامنے۔ ہاں نہ اُس سامنے والی چٹان پر کوئی سرنگوں بیٹھا ہے۔ ہاں ہاں سادھو۔ سمجھے بھی یہ ہے کون؟ ارے میاں یہ ہمارے پُرانے دوست کنور پرتاپ سنگھ ہیں۔ بھئی واللہ! ڈھونگ تو خوب رچایا ہے۔ کیا بڑی بڑی لٹیں ہیں۔ سب مصنوعی۔ غریب جان

چھپاتا پھرتا ہے۔ آؤ ذرا چھپ کر دیکھیں یہ کیا کرتا ہے۔ وہ دیکھو کوئی اور سادھو آرہا ہے۔ او ہو یہ تو گرو جی ہی کی طرف آرہا ہے۔ اے لو پاس پہنچ گیا۔

جگدیش: جگدیش!

جگدیش:۔ ہاں گرو جی۔

گرو جی:۔ بیٹا اس طرح اکیلے دکیلے نہ پھرا کرو۔ دشمن تاک میں ہیں۔ ابھی ابھی میں نے دو آدمیوں کو کنجروں کے بھیس میں دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پولیس کے سپاہی ہیں اور تمہاری تلاش میں آئے ہیں۔

جگدیش نے گرو جی کے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر کہا۔

"گرو جی! پرماتما کے لئے مجھے ان پاپیوں سے بچائیے"۔

گرو جی:۔ رام بھلی کریں گے۔ چپ چاپ میرے پیچھے چلے آؤ۔

یہ دونوں گرو اور چیلے چلتے چلتے بہت دور نکل گئے۔ ایک جگہ ایک گہرے غار کے کنارے گرو جی ٹھہر گئے۔ جگدیش بھی ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گرو جی پر ایکا ایکی نہ معلوم کس بیماری کا دورہ پڑا کہ بتیسی جم گئی، ہونٹ نیلے ہو گئے، آنکھیں لال لال ہوئیں، ہاتھوں میں تشنج ہوا۔ بھنچے، اوپر کو اٹھے۔ جگدیش کے دونوں کندھوں کو جیسے کسی نے شکنجے میں کس لیا۔ کڑک کر بولے:۔

گرو جی:۔ بے گناہ! پاپی۔

ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی۔ ابھی جو چہرہ غصے سے لال پیلا

تھا ایک دم زرد پڑ گیا جن آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا اُن میں خوف و ہراس نمایاں ہوا۔ جگدیش نے پہلے تغیر کو بھی دیکھا تھا اور اِس نئی تبدیلی کو بھی۔ وہ حیران تھا کہ اِتنی دیر میں گرو جی پر دو دو رے مختلف قسم کے کیسے پڑ گئے۔ اُس نے غور سے گرو جی کے منہ کو دیکھا۔ پھر اُس طرف نظر کی جدھر گرو جی سہمے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک بڑا لمبا چوڑا لحیم شحیم ریچھ دونوں ہاتھ سینے پر لٹکائے منہ سے جھاگ اُڑاتا ایک عجیب اندازِ مستانہ سے قدم رکھتا جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جگدیش اِس خوفناک نظارے سے کچھ ایسا سٹ پٹایا کہ گرو جی کو موت کے منہ میں چھوڑ کر ایک دم بھاگا۔ ابھی مشکل سے دس بارہ قدم گیا ہوگا کہ گرو جی کی کرخت چیخ کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ مُڑ کر دیکھا تو گرو جی اور ریچھ دونوں غائب تھے۔ پلٹ کر آیا۔ نیچے جھانک کر غار میں دیکھا۔ گرو جی ایک چٹان پر بے ہوش پڑے تھے۔ ریچھ کا پتہ نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے گرو جی کسی چٹان سے ٹکرا کر ریچھ کی گرفت سے نکل کر چٹان پر گر پڑے اور ریچھ تحت الثریٰ میں چلا گیا۔

جگدیش ڈھلوان اور ناقابلِ گذر راستے سے بڑی مشکل سے جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر لیٹ لیٹ کر نیچے چٹان پر پہنچا۔ گرو جی کو دیکھا تو اپنے خون میں نہلائے ہوئے تھے۔ خون کی قے ہو رہی تھی۔ اُس نے گرو جی کا سر اپنے زانو پر رکھا اور رونا شروع کیا۔ اُس کے آنسوؤں نے پانی کے چھینٹوں کا کام کیا۔ گرو جی نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔

’بے گناہ پاپی‘

جگدیش :- گروجی! اِس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ آپ پاپی کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو دھر ماتما ہیں۔ پرماتما کے اوتار ہیں۔ گروجی۔ گھبرایئے نہیں میں ابھی آپ کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اوپر لے چلوں گا۔ جہنت جی آپ کا علاج کر دیں گے اور دو چار دِن میں آپ بھلے چنگے ہو جائیں گے۔

گروجی یہ سُن کر ہنس دیئے۔ جتنا اور جس طرح اُن کے خون بھرے ہوئے منہ سے ہنسا گیا۔ پھر کہنے لگے۔

گروجی :- بے گناہ پاپی تم ہو تم۔ سمجھے؟ تم ہو مورکھ نادان۔ جو مورکھ ہے وہ پاپی ہے مگر بے گناہ۔ اچھا سنو جو کچھ میں کہتا ہوں میرے علاج اور دوا دارو کی فکر چھوڑ دو۔ ریچھ نے میری ہڈیاں پسلیاں توڑ دی ہیں اور جو باقی بچی تھیں اِس چٹان نے چورا کر دیں۔ میرے بچنے کی کوئی آس نہیں کوئی پل کا مہمان ہوں۔ اِس لیئے جو کچھ کہتا ہوں جلدی سے اُسے سُن لو۔ بیچ میں بولنا مت۔ چُپ چاپ سنے جانا۔

ریاست شیر گڑھ کے راجہ شیر سنگھ کی راجکماری روزمرہ صبح سویرے جھیل پر سیر کو جایا کرتی تھی۔ وہ اور اُس کی سہیلی چیلا دونوں باری باری کشتی کو چلاتی تھیں۔ ایک دِن کشتی اُلٹ گئی۔ راجکماری تیرنا نہ جانتی تھی غوطے کھانے لگی۔

چیپلا نے بڑی کوشش اور جانفشانی سے اُسے سنبھالا مگر عورت ذات تھی کنارے پر نہ لاسکی اور خود بھی غوطے کھانے لگی۔ قریب تھا کہ دونوں لڑکیاں بے دم ہو کر ڈوب جائیں کہ عین اُسی وقت ایک شخص کنارے پر نظر آیا۔ چیپلا کی خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔ اُس نے زور سے کچھ کہہ کر پکارا مگر منہ میں پانی بھر جانے اور تیز سانس چڑھ جانے کی وجہ سے معلوم نہ ہو سکا کہ کیا کہا مگر کنارے والے شخص کے کان میں کچھ آواز گئی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور فوراً کپڑوں سمیت جھیل میں کود پڑا۔ چیپلا نے راجکماری کو اُس کے سپرد کیا اور خود تیرتی ہوئی کنارے پر آ گئی۔ وہ شخص بھی راجکماری کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ راجکماری کو گھاس پر لٹا دیا۔ دونوں کی کوششوں سے راجکماری کو ہوش آ گیا۔ ایک غیر شخص کو پاس بیٹھے بلکہ اپنے اُوپر جھکا ہوا دیکھ کر گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ چیپلا نے مختصر طور پر دونوں کے ڈوبنے کی داستان کہی۔ اور پرماتما کا شکر ادا کیا کہ اِس شریف شخص کی بدولت دونوں کی جانیں بچ گئیں۔ راجکماری بہت کمزور ہو گئی تھی اور چلنے پھرنے کی طاقت اُس میں نہ تھی۔ چیپلا نے کہا میں جا کر پالکی لے آتی ہوں۔ وہ اُدھر گئی، اِدھر کیوپڈ نے اپنے بے پناہ تیروں سے دونوں کے کلیجے چھلنی کر دئے۔

دونوں میں روز بروز محبت بڑھتی گئی۔ کبھی جھیل پر، کبھی جنگل میں گھنے درختوں میں کبھی پرانے کھنڈروں میں خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چیپلا دونوں کی رازداں تھی۔ پیام و سلام اِسی کی معرفت ہوتے تھے۔ رگھبیر سنگھ تھا تو ذات کا چھتری،

مگر معمولی خاندان کا آدمی تھا، راجکماری کے ساتھ شادی کا پیام نہ دے سکتا تھا۔ اس لئے مستقبل کا خیال چھوڑ کر دونوں اپنے زمانۂ حال میں مست تھے دو سال یوں ہی گذر گئے۔ اس کے بعد رام گڈھ کے راجہ نے اپنے کنور کا پیام راجکماری کے لئے دیا۔ کچھ عرصے کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ راجکماری چندر کور کی آخری ملاقات اپنے عاشق ناشاد رگھبیر سنگھ کے ساتھ درحقیقت خون کے آنسو رُلانے والی تھی مگر قسمت کا لکھا نہیں مٹتا۔ چندر کور سسرال گئی مگر اپنے عاشق نامراد کے خیال میں ڈوبی ہوئی۔ رام گڑھ کا راجکمار پرتاپ سنگھ بھی نہایت خوبصورت اور حسین وجمیل تھا مگر کیوپڈ کا تیر جن دو دلوں کو چھید دیتا ہے وہی دونوں فضائے عالم میں ہر وقت اور ہر دم ساتھ رہتے ہیں۔ اُن کی مقناطیسی کشش اور تعلق کو کوئی چیز جُدا نہیں کر سکتی۔ رگھبیر سنگھ اُدھر سراسیمہ و سرگرداں تھا تو چندر کور اِدھر حیران و پریشاں۔ کچھ دن یوں ہی گذر گئے۔ رگھبیر سنگھ چندر کور سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔ بھیس بدلے ہوئے رام گڈھ میں پھرا کرتا تھا مگر دیدار یار کسی طرح میسر نہ ہو سکا۔ کوئے جاناں میں رسائی ممکن نہ ہوئی۔ ایک دن وہ ڈاکوؤں سے مِلا اور بہت سا روپیہ خرچ کر کے تھیٹر کا ایک پارٹ اس خوبی اور خوش اسلوبی سے کیا کہ کنور پرتاپ سنگھ اُس کا دَم بھرنے لگا۔ اب رگھبیر سنگھ یعنی جسونت سنگھ پرتاپ سنگھ کی ناک کا بال تھا۔ اس کے لئے ہر شب شب برات تھی۔ وہی چیلا پرانی راندھاں تھی، چور دروازے سے رانی چندر کور کے محل

میں پہنچتا. باہر سنتری کا پہرہ دیتا رہتا جو دگنی تنخواہ چندرکور کی جیب خاص سے پاتا تھا۔ کچھ عرصہ یوں ہی عیش و عشرت میں گذرا۔ ایک دن ایکا ایکی کنور پرتاپ سنگھ چندرکور کے کمرۂ خاص میں گھس آیا اور جسونت سنگھ کو رانی کے پہلو میں بیٹھا دیکھکر آگ بگولا ہو گیا. جسونت سنگھ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پرتاپ سنگھ نے اُسے زخمی کر کے گرا دیا اور اپنی دانست میں گویا اُس کا کام تمام کر دیا چندرکور بھی غضب کی دلیر عورت ہے. ایسے موقعہ پر حواسوں پر قابو رکھنا مشکل ہے مگر وہ ذرا نہ گھبرائی اور اپنے تریا چلتر سے پرتاپ سنگھ کو بہکا دیا. وہ مورکھ نادان جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپتا پھرا. میں جو درِاصل ڈاکوؤں کا سردار ہوں، اس وقت اُن دونوں کا مشیر کار بنا. جسونت سنگھ کے دراصل زخم کاری نہیں لگا تھا. پرتاپ سنگھ کے جاتے ہی خفیہ طور پر اُس کی مرہم پٹی ہوئی اور دو چار ہی دن میں تندرست ہو گیا. ادھر رانی نے ایک اور چال چلی. رام گڈھ کے پاگل خانے میں ایک شخص مسمی رام داس پاگل تھا جو شکل و صورت میں پرتاپ سنگھ سے بہت ملتا جلتا تھا. پاگل خانے کے داروغہ نے دو ہزار روپے لیکر اس پاگل کو خفیہ طور پر جسونت سنگھ کے سپرد کر دیا جس نے چار بجے رات کو اُس پاگل کو پرتاپ سنگھ کے کپڑے پہنائے اور لے جا کر جھیل میں ڈبو دیا۔ دوسرے دن لاش پانی پر تیر آئی. رانی نے اُسے پہچانا. خوب ٹسوے بہائے. روئی پیٹی اور اس طرح کنور پرتاپ سنگھ دنیا کی نظروں میں

کیسا آراستہ پیراستہ کمرہ ہے۔ بس آپ جھاڑ فانوسوں کو نہ دیکھئے اور اِن بڑی بڑی قدِ آدم تصویروں پر سے بھی نظر ہٹائیے۔ آپ تو اِن دونوں جیتی جاگتی تصویروں کو دیکھئے اور سنئے یہ کہہ کیا رہی ہیں۔

رانی:۔ پیارے آج اُداس کیوں ہو۔ طبیعت تو اچھی ہے؟

جسونت سنگھ:۔ چندرا! آج نہ معلوم کیوں دل بیٹھا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی آفت آنے والی ہے۔

رانی:۔ آفت وافت کیا آئے گی۔ پرماتما کے لئے ایسے شبد زبان سے نہ نکالئے میری خود ہی صبح سے سیدھی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ میں ابھی راج وید کو بلواتی ہوں۔ دوا دیدیگا۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

جسونت سنگھ:۔ رانی میں سچ کہتا ہوں۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ مگر دل اندر سے بیٹھا جا رہا ہے۔ میری بھی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ رام جانے کیا ہونے والا ہے۔ مجھے رہ رہکر پرتاپ سنگھ کا خیال آتا ہے۔ کئی دفعہ تم سے کہا کہ اِس کانٹے کو الگ ہی کردو مگر نہ معلوم تم ڈرتی کیوں ہو۔

رانی:۔ پرتاپ سنگھ وہاں پاگل خانے میں پڑا پڑا تمہارا کیا بگاڑ رہا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اُس کے خون سے کیوں ہاتھ رنگیں۔ برس چھ مہینے میں اپنے آپ مرجائے گا۔

جسونت سنگھ:۔ کل داروغہ آیا تھا۔ کیا کہتا تھا؟

Sporting
Sporting

رانی :- کہتا تھا کہ پرتاپ سنگھ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے ۔ اور دو چار مہینے کی بات ہے ۔ اِس سے زیادہ نہیں جی سکتا ۔ جب ہی تو میں کہتی ہوں کہ ہم خواہ مخواہ کیوں ۔۔۔۔۔۔۔"

وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ چور دروازے میں سے پرتاپ سنگھ دبے پاؤں آ کر سامنے کھڑا ہو گیا ۔ اُسے دیکھتے ہی رانی نے چیخ ماری ۔ جسونت سنگھ نے چھلانگ مار کر پرتاپ سنگھ کو پکڑ لیا ۔ پرتاپ سنگھ بولا :-

"بھائی جسونت فقط دو منٹ کے لئے مجھے اجازت دو ۔ دیکھو میں خود ہی مر رہا ہوں ۔ مرے کو مارنے سے کیا فائدہ ؟"

جسونت سنگھ نے پرتاپ سنگھ کو چھوڑ دیا ۔ رانی بھی کھڑی ہو گئی اور جلدی سے کہنے لگی :-

رانی :- پرتاپ سنگھ ! وعدہ کرو کہ چُپ چاپ پھر پاگل خانے میں چلے جاؤ گے تو دو منٹ کی جگہ میں تمہیں پانچ منٹ دیتی ہوں ۔

پرتاپ سنگھ :- ہاں رانی میں وعدہ کرتا ہوں ۔ میری دو باتیں سن لو ۔

رانی :- کہو ۔

پرتاپ سنگھ :- اب یہاں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے ۔ میں مہینہ بیس دن سے زیادہ نہیں جی سکتا ۔ مہربانی کر کے مجھے صاف صاف بتا دو کہ تمہیں جسونت سنگھ سے سچی محبت ہے ؟

رانی :۔ ہاں۔

پرتاپ سنگھ :۔ ہماری شادی کے بعد ہوئی ہے یا شادی سے پہلے سے ہے؟

رانی :۔ شادی سے پہلے سے ہے۔

پرتاپ سنگھ :۔ تو پھر میرے ساتھ شادی کیوں کی؟

رانی :۔ رگھبیر سنگھ غریب آدمی تھا اور میں راجہ کی بیٹی۔ بھلا ایسی صورت میں میرا باپ اُس کے ساتھ کیسے شادی کر دیتا۔

پرتاپ سنگھ :۔ رگھبیر کون ہے؟

رانی :۔ جسونت سنگھ کا اصلی نام رگھبیر سنگھ ہے۔

پرتاپ سنگھ :۔ تو جب تم دونوں میں آپس میں محبت تھی تو تم نے کہیں اپنا کالا منہ کیا ہوتا۔ میری زندگی کیوں برباد کی؟

جسونت سنگھ :۔ (جلدی سے) بس کنور جی تشریف لے جائیے۔ پانچ منٹ ہو چکے۔

اِس کا یہ کہنا تھا کہ پردے کے پیچھے سے شیر سنگھ (رانی چندر کور کا باپ) راجہ رام سنگھ (پرتاپ سنگھ کا باپ) اور جے سنگھ (پرتاپ سنگھ کا چچا زاد بھائی) نکل کر جھٹ سامنے آ گئے۔ چندر کور "ہے بھگوان" کہہ کر گر پڑی۔ جسونت سنگھ تھر تھر کانپنے لگا۔ راجہ رام سنگھ اپنے مدتوں کے بچھڑے ہوئے لال سے لپٹ کر رونے لگا جسے وہ مُردہ سمجھے ہوئے تھا۔ جے سنگھ بھی رو رہا تھا۔ ہاں البتہ شیر سنگھ شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ آنکھیں خونِ کبوتر بنی ہوئی تھیں۔ اُس نے

گری ہوئی رانی کا ہاتھ پکڑ کر زور سے گھسیٹا اور کہا

شیر سنگھ:- کم بخت ناشدنی! پیدا ہوتے ہی مرجاتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا بے حیا تو نے سارے خاندان کی ناک جڑ سے کاٹ دی.

رانی باپ کے قدموں سے لپٹی دھاروں رو رہی تھی. شیر سنگھ نے جھڑک کر کہا.

شیر سنگھ:- میں سب کچھ پردے کے پیچھے سے سُن چکا ہوں (پرتاپ سنگھ سے مخاطب ہوکر) بیٹا! اِس ہتھیاری نے مجھے اِس قابل نہیں رکھا کہ تم سے آنکھیں چار کر سکوں. تم نے بڑی مصیبتیں جھیلیں اُن کے دُہرانے سے تمہیں ضرور تکلیف ہوگی مگر میں سارے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں.

پرتاپ سنگھ نے اپنا جھیل پر برائے سیر جانا، ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنسنا جسونت سنگھ کی مدد سے رہائی پانا، جسونت سنگھ پر بھروسہ اور اعتماد کرنا، اُس کا بغلی گھونسہ ثابت ہونا. رانی کے پاس اُسے مصروفِ اختلاط دیکھکر اُس کا خون کھول جانا، جسونت سنگھ کو مارنا، اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگنا، سادھوؤں کے بھیس میں مدتوں جنگل جنگل مارے مارے پھرنا. گروجی کا مرتے وقت تمام حالات سے مطلع کرنا. اپنا افتاں و خیزاں رانی کے پاس آنا، پاگل خانے بھیجدیا جانا، وہاں سخت سے سخت تکالیف کا برداشت کرنا، روزمرہ وہاں کے ملازمین کی خوشامد کرنا. اُن کو اصلی واقعات سمجھانے کی کوشش کرنا، اُن کا ہنسی مذاق اُڑانا، اور اُسی درحقیقت رام داس پاگل سمجھنا پوری تفصیل کے ساتھ سُنا کر کہا:-

پرتاپ سنگھ:۔ اس آٹھ مہینے کے عرصے میں کئی دفعہ دیوان جی، بخشی جی، منتری جی اور ریاست کے دیگر عہدیدار پاگل خانے میں آئے۔ میں نے ہر ایک کی خوشامد کی کہ دو منٹ کے لئے ٹھہر جائیں اور میری سرگذشت سُن لیں مگر داروغہ نے مجھے مار مار کر دھکیل دیا۔ اور اُن لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ بڑا خوفناک پاگل ہے اس کے قریب بھی نہ جائیے گا۔ پرسوں میرے ساتھ کا کھیلا ہوا میرا بھائی جے سنگھ میری خوش قسمتی سے وہاں آگیا جب میری کوٹھڑی کے پاس پہنچا تو میں نے اُس سے کہا کہ بھائی جے سنگھ تمہیں یاد ہے اُس دن تم پرتاپ سنگھ کے ساتھ شیر کے شکار کو ٹیکرے گئے تھے تم نے خنجر سے شیر کو مارا تھا مگر اُس کے پنجوں کا نشان اب تک تمہارے سینے پر ہے۔ یہ سُنکر جے سنگھ کو بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے مجھسے پوچھا تم کون ہو جو یہ ساری باتیں جانتے ہو۔ میں نے جلدی سے اپنا شانہ کھول کر دکھایا کہ لو یہ دیکھو پرتاپ سنگھ کو بھی شیر نے یہ نشانی دی ہے جو آج اُس کے بڑے کام آئی۔ داروغہ جے سنگھ کو بھی منع کرتا رہا مگر اُس نے مجھے کوٹھڑی کے باہر نکلوادیا۔ میں نے اُسے جلدی جلدی اپنے خاندان کے تمام افراد کے نام بتائے، اپنی شادی کا حال سُنایا اور ہم دونوں میں جو آپس میں سینکڑوں باتیں راز کی ہوتی تھیں، بیان کرکے کہا کہ اب اور کچھ سوالات کرکے تم اپنا پورے طور پر اطمینان کرلو کہ میں پرتاپ سنگھ ہی ہوں یا نہیں پھر میں اپنا قصۂ غم سناؤں گا جسے سُن کر تم رو دو گے بھی اور تمہارا خون بھی کھول جائے گا۔ مختصر یہ ہے کہ میں نے اپنا تمام حال اول سے آخر تک اُسے سُنایا

جیسے سُن کر وہ مجھ سے لپٹ کر ایسا رویا ایسا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر پاگل خانے کے داروغہ اور دیگر ملازمین کو معافی کی امید پر خاموش رہنے کی تاکید کی۔ مجھے بھیس بدلوا کر اپنے محل میں لے گیا اور خود راجہ شیر سنگھ کو بُلا لایا اور آج اُسی کی جانفشانی و کوشش سے یہ تھیٹر کا پارٹ اِس طور پر ادا کیا گیا۔

اب فقط اِتنا اور بیان کرنا ہے کہ رانی چندر کور نے اُسی دن زہر کھا کر جان دیدی۔ جسونت سنگھ کی دونوں آنکھیں نکلوا کر اُسے بھیک مانگنے کیلئے چھوڑ دیا اب وہ بھیک مانگ کر گذارا کرتا ہے۔ ریاست کے چھوٹے بڑے سب اُسے جانتے ہیں۔ کوئی اسپر تھوکتا ہے، کوئی اُسے پتھر مارتا ہے۔ چار چار وقت ہو جاتے ہیں پانی بھی میسّر نہیں آتا۔ سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ ریاست سے باہر جا نہیں سکتا سپاہیوں کو حکم ہے کہ فصیل شہر سے باہر نہ نکلنے دو۔ بیچارا دو چار مہینے کا مہمان نظر آتا ہے۔ راجہ شیر سنگھ (رانی کے باپ) کو اِس واقعہ سے کچھ ایسا دھکّا لگا کہ اُس کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور اپنے چھوٹے سے لڑکے کو گدّی کا وارث بنا کر منتری یعنی وزیر ریاست کو اُس کا مشیر و نگراں کر دیا اور خود سادھو بن کر کاشی جی کی راہ لی۔ پرتاپ سنگھ کو بھی راج پاٹ سے نفرت ہو گئی اور یہ دونوں باپ بیٹے بھی جے سنگھ کو راجہ بنا کر خود بنارس چلے گئے۔

(مطبوعہ ساقی جولائی ۱۹۳۲ء)

روح کیا چیز ہے

مدتوں سے میرے دل میں کُریدنی سی لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ روح کیا چیز ہے، مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، جو مرتا ہے اپنے عزیز و اقارب سے۔ دوست رشتہ داروں سے۔ اُن سے جن کے خون کا اثر اُس کی رگ رگ میں تھا۔ اُن سے جن کی رگ و پے میں اس کے اپنے خون کا اثر تھا، کیوں آنکھیں پھیر لیتا ہے اور پلٹ کر خبر بھی نہیں لیتا کہ تم پر میرے مرنے کے بعد کیا گذر رہی ہے۔ میرے دل میں حسرت تھی کہ کسی صورت سے یہ معلوم کیا جائے کہ روح جسم کو چھوڑ کر کہاں جاتی ہے، کہاں رہتی ہے، پھر اس دُنیا میں جہاں نصف صدی یا کم و بیش رہی ہے کبھی آتی بھی ہے یا بھول کر بھی ادھر کا رُخ نہیں کرتی۔ اکثر راتوں کو بارہ ایک ایک بجے تک پڑا کروٹیں بدلا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا اللہ پاک سے دعا مانگ کر سوتا تھا کہ پروردگار عالم اپنی رحمت سے یا تو مجھے خواب میں اس راز کو کچھ نہ کچھ سمجھا دے یا میرے دل سے یہ خلش دُور کر دے جس نے میری نیند بھی حرام کر رکھی ہے۔ اکثر خواب بھی دکھائی دیتے تھے

مگر کچھ ایسے بے ربط و غیر مسلسل کہ بجائے تسلّی و اطمینان ہونے کے اور بھی اُلجھن ہوتی تھی۔

پاگل پن بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ کاٹتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، تھوکتے ہیں، بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ماریں نہ کاٹیں، بولیں نہ چالیں، گُم سُم کسی خاص خیال میں محو رہتے ہیں۔ بس مَیں بھی اسی طرح کا پاگل ہو گیا تھا۔ یوں تو دُنیا کے سارے کام کرتا تھا۔ فکرِ معاش، بال بچوں کے آرام کا خیال، چیز بست کی خرید و فروخت کھانا پینا، پہننا غرض جو اور لوگ کیا کرتے ہیں میں بھی کرتا تھا۔ مگر جب روح کی اصلیت معلوم کرنے کا خیال آتا تھا تو ایک جنوں کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ گھنٹوں چُپ چاپ پڑا سوچا کرتا تھا۔

پچھلے مہینے کا ذکر ہے کہ میرے شملہ کے چند دوستوں نے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتروں میں ملازم ہیں، مجھے بے طرح مجبور کیا کہ چھٹی لے کر یہاں آؤ اور قدرت کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو۔ میں بھی قدرت کی صناعیوں کا بھوکا ہوں بڑا دل پھڑکا کرتا ہے۔ بائسکوپ میں پاتھے کمپنی کے سین سینری کے فلم دیکھتا ہوں تو دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ بھلا کہاں میں اور میری حالت کہ بال بال نون تیل لکڑی میں گرفتار ہے اور کہاں دنیا کی سیر اور تو کچھ نہیں کر سکتا بس اُن امیروں کو بُرا بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا کر لیتا ہوں جو دولت والے ہیں۔ لاکھوں رُوپے کے مالک کہلاتے ہیں مگر دراصل دولت کے مالک نہیں محافظ ہیں۔ جیسے آپ نے

یا میں نے نوکر گھر کی چوکسی کے لئے رکھ لیا بلکہ اس سے بھی بدتر کہ آپ یا میں اُس نوکر کو تنخواہ تو دیتے ہیں مگر یہ نام نہاد دولت والے تو ایسی چوکسی کرتے ہیں کہ نہ تو خود اُس میں سے کچھ لیتے ہیں اور نہ کسی کو لے جانے دیتے ہیں بلکہ ماہ بماہ اور اپنی گرہ سے کچھ نہ کچھ ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ سُنا آپ نے یہ امیر ہیں۔ یہ دولت مند کہلاتے ہیں۔ جب تک جیتے ہیں جھک جھک بک بک میں گزرتی ہے۔ مرتے ہیں تو ایک ہڈی چھوڑ جاتے ہیں جس پر کتے لڑتے رہتے ہیں۔ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے، بھنبھوڑے لیتا ہے۔ چاہتا ہے کہ میں ہی ساری کی ساری ہڈی ہضم کر جاؤں۔ دوسرے کو ایک چھیچھڑا تک نہ دوں۔

خیر مختصر یہ ہے کہ میں نے ایک مہینے کی چھٹی لی اور ایک ٹرنک، ایک بستر، ایک لوٹا لے کر رات کی گاڑی سے سوار ہو گیا۔ علی الصباح گاڑی کالکا پہنچی۔ میں وہیں اُتر پڑا۔ اس خیال سے کہ ایک دن یہاں ٹھہر کر کسولی بھی دیکھتا چلوں پیدل دس گیارہ میل جاؤں گا بہت لطف آئے گا۔ اسباب ایک ہوٹل میں رکھ کر کسولی کی سڑک پر چل پڑا۔ اب یہاں سے ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ کوئی تین ساڑھے تین میل چلا ہوں گا کہ ٹانگیں تھک گئیں۔ ذرا دُور ایک چھوٹی سی دکان دکھائی دی وہاں گیا۔ اور تو کچھ ملا نہیں کچھ بسکٹ لے کر کھائے، پانی پیا۔ پھر وہیں ایک پتھر پہ بیٹھ کر سگرٹ پینے لگا۔ صبح کا سہانا وقت۔ پہاڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔ پتلی پتلی پانی کی دھاریں جگہ جگہ بہہ رہی تھیں۔ بھلا ایسے وقت میں

میرا جنوں مزاج پُرسی کو نہ آتا تو کب آتا؟ آیا اور بڑی شان سے آیا. خبر نہیں کبتک میں اِسی غور و فکر میں غلطاں پیچاں رہا اور کب وہاں سے اُٹھا یہ تو یاد نہیں مگرہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک فقیر جُھکا ہوا کچھ مرہم پٹی کر رہا ہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدہر اُدھر دیکھنے لگا. اُٹھنے کی کوشش کی مگر فقیر نے بڑی نرمی سے کہا" میاں لیٹے رہو نہیں تو خون پھر بہنے لگے گا بڑی مشکل سے تھما ہے"۔ میں نے پوچھا میں کہاں ہوں اور مجھ پر کیا گزری تو فقیر نے کہا کہ تم اُس چٹان پر سے گر پڑے تھے. سر میں چوٹ لگی ہے مگر کچھ ڈر نہیں خون بند ہوگیا ہے ۔ دو چار دن کی بات ہے اچھے ہو جاؤ گے. میں نے پوچھا کسولی کی سڑک یہی ہے نا؟ فقیر نے کہا نہیں وہ اور سڑک ہے. یہ دوسری ہے. آؤ میرے ساتھ آؤ. بارہ بج چکے ہیں. تم کمزور بھی ہو گئے ہو. کچھ کھا پی لو. کوئی دو فرلانگ چل کر ہم فقیر کی جھونپڑی میں پہنچ گئے. یہاں پہنچ کر اُس نے مجھے دو قسم کی ترکاریاں دیں. جو نہایت لذیذ اور عمدہ تھیں. مگر میں نے آجتک کبھی نہ کھائی تھیں. اِسکے بعد مجھے دودھ پلایا. میں نے جو یہاں آرام پایا تو ذرا دل ٹھکانے ہوا اور میں نے سوچا کہ اللہ والے لوگ ہیں لاؤ ان شاہ صاحب ہی سے پوچھو. کیا عجب ہے کہ میری دل جمعی کر دیں. یہ سوچ کر میں نے اپنی سرگزشت شاہ صاحب کو سُنائی. بہت غور سے سُنتے رہے. جب میں کہہ چکا تو بولے. میاں صاحبزادے! اِن باتوں میں نہ اُلجھو. تم دُنیا دار آدمی ٹھہرے. اِن باتوں میں پڑ کر کسی مصرف کے نہ ہوگے.

میں نے کہا تو کسی طرح میرے دل سے یہ خیال ہی نکال ڈالیئے۔ میں تو لاکھ چاہتا ہوں کہ میری جان اِس عذاب سے چھُوٹے۔ بہتیرا خیال بٹاتا ہوں اور دوسری باتوں کی طرف طبیعت کو متوجہ کرتا ہوں مگر جب اِس جنون کا زور ہوتا ہے تو میری ایک نہیں چلتی۔ آج ہی دیکھئے میں اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو اِس طرح گرتا؟ فقیر نے کہا خیر اگر تم نہیں مانتے تو سنو۔ دیکھو وہ جو سامنے آدمی کے سر کی وضع کی پہاڑی دکھائی دے رہی ہے نا، وہ سامنے جہاں چیل اُڑ رہی ہے اُس کے اُوپر تمہیں چڑھنا ہوگا۔ کچھ دُور نہیں ہے۔ کوئی چار میل کا فاصلہ ہوگا۔ عین اُس کے سر کے اوپر کھڑے ہو کر اپنے آگے نظر ڈالنا۔ ایک دریا بہتا دکھائی دیگا وہاں چلے جانا ڈرنا نہیں پانی بالکل پایاب ہے ہاں ذرا زور سے بہتا ہے۔ اُس دریا کو پار کرنے کے جو چڑھائی شروع ہوتی ہے اُس پر چڑھنا شروع کر دینا۔ آدھے میل کی مسافت کے بعد اُلٹے ہاتھ کی طرف ایک تاریک غار دکھائی دیگا۔ اُس میں اُتر جانا۔ مگر دیکھنا بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا۔ اگر وہاں پھسل پڑے تو پھر خیر نہیں۔ جب تم غار کی تہہ میں پہنچ جاؤ تو پہاڑ کی دیوار کو ہاتھ سے پکڑے پکڑے آگے چلنا۔ کوئی پچاس قدم چلنے کے بعد تمہیں اُس دیوار میں ایک شگاف سا معلوم ہوگا اُس میں چلے جانا۔ بیس قدم کے بعد ایک موڑ آئے گا۔ یہاں سے روشنی نمودار ہوگی۔ اندھیرا جاتا رہے گا۔ سامنے پتھر کی ایک چھوٹی سی چار دیواری نظر آئے گی۔ اُس میں چلے جانا۔ وہاں تمہیں ایک شاہ صاحب

ملیں گے جو تمہارے سوالوں کا اطمینان بخش جواب دیدیں گے. اب تم خوب سوچ سمجھ لو اور غور کر لو. اِس سفر میں جان کا خطرہ ہے. اگر دِل ٹھکے تو جاؤ ورنہ خیر سے اپنے گھر سِدھارو اور پھر بُھول کر بھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا. یہ بھی ایک اتفاق کی بات تھی کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا اور یہاں لے آیا ورنہ اِس جگہ کا تو لوگوں کو علم بھی نہیں.

میں نے اُن شاہ صاحب کے ہاتھ چُومے اور کہا میرے رہبر میرے ہادی میں آپ کا کِس زبان سے شُکریہ ادا کروں. آپ نے مجھے سیدھے راستے پر ڈال دیا. خدا آپ کو جزائے خیر دے. اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں انشاءاللہ تعالےٰ اُن بزرگ روشن ضمیر کی خدمتِ اقدس میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا اور وہ حضرت میری خاطر خواہ دل جمعی کر دیں گے.

میں وہاں سے چل پڑا اور کوئی پانچ بجے راستے کی مصائب طے کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا. شاہ صاحب نمازِ عصر پڑھکر وظیفہ پڑھ رہے تھے. میں جان کر اُن کے سامنے نہ گیا. جب وہ پڑھ چکے تو میں نے سامنے جاکر بڑے ادب سے سلام کیا. اُنہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا اور فرمایا تم نے مجھے پہچانا. اب جو میں نے اُن کی شکل اچھی طرح سے دیکھی تو حیران رہ گیا اور عرض کیا یا حضرت! میری عقل حیران ہے. حضور یا تو وہی شاہ صاحب ہیں جنہوں نے مجھے از سرِ نو زندگی بخشی. میرے ساتھ باپ سے زیادہ مشفقانہ

سلوک کیا۔ ورنہ میں اُس غیرآباد مقام میں یا تو کثرت سے خون نکلنے کی وجہ سے مرجاتا یا کسی درندے کی خوراک بنتا۔ یا حضور اُن کے حقیقی بھائی ہیں۔ شاہ صاحب یہ سُن کر مُسکرائے اور فرمایا میں وہی شخص ہوں۔ مگر تم یہ کہوگے کہ میرے سوال کا جواب وہیں کیوں نہ دے دیا تو سنو میں تمہارے دل و دماغ کو اُس کا جواب سُننے کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا۔ تمہارا سوال معمولی نہیں ہے۔ اِس لیے اُس کا جواب سُننے سے پہلے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے تاکہ تم خوب اچھی طرح سے سمجھ جاؤ۔ وہ سامنے ندی ہے جاؤ جلدی سے وضو کر آؤ۔ ابھی تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ جلدی کرو۔

میں نے جاکر جلدی جلدی وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ پھر شاہ صاحب کے فرمانے سے دو سو بار اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ پڑھا۔ اِتنے میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ شاہ صاحب نے نماز پڑھائی اور پھر میں نے دو سو بار وہی آیت شریف پڑھی۔ نماز و وظائف سے فارغ ہو کر شاہ صاحب نے ایک عجیب قسم کا پھل لیکر ہڈی کی طرح جھاڑنا شروع کیا۔ اُس میں سے چاول کی طرح کی سفید سفید چیز اتنی ساری نکلی کہ دو مٹی کی رکابیاں بھر گئیں۔ ایک رکابی مجھے دی اور دوسری میں سے پاؤ خود کھائی۔ مجھے وہ چیز کچھ ایسی مزے کی معلوم ہوئی کہ میں اپنی ساری رکابی ختم کر گیا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے نہایت ہی میٹھے کیلے کے چاول بنا دیئے ہیں۔ کھانے کے بعد شاہ صاحب نے

حدیث الدُّنیا جیفۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ[1] کے معانی ومطالب ونکات کچھ اِس خوبی سے سمجھائے کہ دِل باغ باغ ہوگیا۔ دُنیا کی قدرومنزلت دل سے مفقود ہوگئی اور فی الواقع دُنیا کے طالب کتوں کی شکل میں دکھائی دینے لگے اِس کے بعد آیہ شریف یُدْرِکْکُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ[2] کا مطلب بہت سی احادیث کے ساتھ مِلا مِلا کر اِس ڈھنگ سے سمجھایا کہ موت سامنے کھڑی دکھائی دینے لگی۔ دُنیا کی بے ثباتی کی تصویر کھنچ گئی۔ جس طرح حمام میں نہلانے والا مَل مَل کر نہلاتا ہے، خوب مَیل چھڑاتا ہے، کبھی بدن کو گھستا ہے رگڑتا ہے، کبھی پانی ڈالتا ہے۔ اِسی طرح اِن دو گھنٹوں میں شاہ صاحب نے میری روح کو غسل دے کر خوب پاک وصاف کیا۔ پھر مجھ سے فرمایا اب عشاء کی نماز پڑھو اور ایک ہزار بار اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پڑھ کر وہیں سو جانا میں نے حسب ارشاد عمل کیا۔ صبح کو نماز و وظائف سے فارغ ہو کر شاہ صاحب نے فرمایا جاؤ اوپر پہاڑی پر سے کسی مرد کو بلا لاؤ۔ میں جا کر ایک کسان کو بلا لایا آپ نے اُس سے پوچھا کچھ پڑھنا لکھنا جانتے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ نہیں شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ تم نے اقلیدس پڑھی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ جی ہاں مدرسے میں پڑھی تو تھی۔ فرمایا اڑتالیسویں شکل یاد ہے۔ میں نے عرض

---

[1] دنیا مردار چیز ہے اور اسے طلب کرنے والے کتے ہیں

[2] موت تمہیں دبوچ لے گی چاہے تم مضبوط سے مضبوط برجوں ہی میں کیوں نہ ہو۔

کیا۔ جی ہاں کچھ یاد تو ہے۔ فرمایا اچھا اس کسان کو سمجھاؤ اور اس طرح سے سمجھاؤ کہ یہ جا کر اور لوگوں کو سمجھا سکے۔ یہ کہکر ایک کاغذ اور پنسل مجھے دیدی۔ میں نے کسان سے پوچھا تم جانتے ہو زاویہ کسے کہتے ہیں۔ اُس نے کہا نہیں۔ میں نے اُسے کاغذ پر کھینچ کھینچ کر طرح طرح سے سمجھانے کی کوشش کی وہ مطلق نہ سمجھ سکا آخر میں نے شاہ صاحب سے کہہ دیا کہ حضور یہ ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔

شاہ صاحب :۔ کیوں

میں :۔ یہ بالکل ان پڑھ اور جاہل ہے۔

شاہ صاحب :۔ اگر کوئی شخص چوتھی یا پانچویں جماعت تک تعلیم پا چکا ہو تو اُسے سمجھا دو گے ؟

میں :۔ حضور سچی بات تو یہ ہے کہ پہلے اقلیدس کی اصطلاحات سمجھنی چاہئیں۔ پھر پہلی شکل، پھر دوسری، پھر تیسری۔ اسی طرح سے جب سینتالیسویں شکل سمجھ میں آجائے تو پھر اڑتالیسویں شکل بھی سمجھانے سے سمجھ میں آجائے گی ورنہ کبھی ہرگز نہیں آسکتی

شاہ صاحب :۔ ذرا سوچ سمجھو اور غور کرو تو اپنے سوال کا جواب اپنے ہی جواب سے پا لو گے۔

میں :۔ حضور! میں کچھ سمجھا نہیں حضور ہی سمجھائیں۔

شاہ صاحب :۔ اگر یہ کسان تم سے سوال کرے کہ اقلیدس کی اڑتالیسویں شکل کیا

چیز ہے مجھے سمجھاؤ، تو تم اُسے کیا جواب دو گے؟

میں:۔ یہی کہ تم پہلے مدرسہ میں داخل ہو کر یا گھر پر اُستاد رکھ کر یا کسی کے پاس خود جا کر چھٹی جماعت تک کی مکمل باقاعدہ تعلیم حاصل کرو۔ پھر اقلیدس شروع سے سمجھکر تھوڑی تھوڑی پڑھنی شروع کر دو۔ جب پڑھتے پڑھتے سینتالیسویں شکل پڑھ چکوگے تو میرے پاس آنا میں اڑتالیسویں شکل سمجھا دوں گا۔

شاہ صاحب:۔ روح کا علم اقلیدس کے علم سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح اقلیدس کی اڑتالیسویں شکل ہر گنوار نہیں سمجھ سکتا۔ ہر معمولی تعلیم ولیاقت والا آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جس نے اقلیدس شروع سے نہ پڑھی ہو۔ اسی طرح روح کا علم سمجھنے کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انسان گناہوں سے پاک وصاف ہو۔ نفسِ امارہ پر قابو رکھتا ہو۔ دُنیا سے بیزار ہو۔ اُسے ذلیل سمجھے۔ موت کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔ خدا کا حکم اس طرح بجا لائے کہ سجدے میں سر ہے۔ گلے پر خنجر۔ مگر خنجر کا خوف نہیں۔ نماز پڑھ رہے ہیں۔ بچے ذبح ہو رہے ہیں کچھ پرواہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نمازیں جن کی ہوتی تھیں ایسی ہی ہوتی تھیں کہ کسی اور طرف خیال جاتا ہی نہ تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فتح کے بعد آقائے نامدار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لوگوں کو مال غنیمت تقسیم کیا ایک صحابی کے حصے میں بھی بہت سی اشرفیاں آئیں۔ آپ لے کر گھر آئے اور

بیوی سے کہا یہ لو ہمارا حصہ ملا ہے اسے کہیں اچھی جگہ رکھ دو۔ بھلا اللہ والے لوگوں کے گھر میں بکس، صندوق، صندوقچے کہاں۔ بیوی ایک مٹی کی ہنڈیا اٹھا لائیں۔ اشرفیاں اس میں رکھیں۔ صحابی صاحب کہیں کونے کھدروے میں رکھ آئے۔ مغرب کا وقت ہوا۔ کھڑے ہوئے نماز پڑھنے۔ خیال آیا کہ ان اشرفیوں سے اونٹ خریدیں گے اور یہ کریں گے اور یوں نفع ہوگا۔ آپ نے نیت توڑ ڈالی۔ لاحول پڑھکر پھر نیت باندھی اب کے پھر اسی طرح کے خیالات آنے شروع ہوئے۔ پھر نیت توڑ دی اور پھر باندھی۔ تیسری دفعہ پھر وہی خیالات آئے اور بھی زیادتی کے ساتھ۔ بس اس دفعہ آپ نیت توڑ کر فوراً وہاں پہنچے جہاں ہنڈیا رکھی تھی۔ ہنڈیا اٹھائی۔ لئے لئے گئے جا کر دروازہ کھولا اور باہر پھینک، کنڈی لگا چلے آئے اور خوب دل لگا کر نماز پڑھی سبحان اللہ! کیسے لوگ تھے، کیسی ان کی نمازیں تھیں، کس پائے کے ان کے روزے تھے۔ پانی سے افطار کیا۔ موٹا جھوٹا دال دلیا لیکر بیٹھے ہی تھے کہ سائل کی آواز کان میں آئی۔ سب اٹھا کر دیدیا۔ آپ اللہ کا شکر کر کے یوں ہی روزے پہ روزہ رکھ لیا۔ تم ڈپٹی کمشنر کے پاس جاتے ہو۔ اول تو گھنٹوں تمہاری تیاری ہی میں لگ جاتے ہیں۔ اٹھے ضرور پانچ بجے کیونکہ الارم شام ہی سے لگا دیا تھا۔ مگر نماز؟ اوہو! خیر۔ لاؤ اب اٹھے ہیں تو شرماشرمی دنیا دکھاوے کو دو چار ٹکریں مار ہی لیں۔ مگر خیال ہے وہیں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یا حجامت میں کہ کھونٹی باقی نہ رہ جائے۔ یا ٹائی۔ کالر سوٹ بوٹ میں غرض ہزار بناؤ سنگھار کے بعد تم ڈپٹی کمشنر کے پاس جاتے ہو اور جہاں وہ ذرا

ڈپٹ کر بولا اور تم لگے تھر تھر کانپنے۔ حالانکہ ڈپٹی کمشنر بادشاہ نہیں، وزیر نہیں، ہاتھ کاٹنے کا اِسے اختیار نہیں۔ کان یہ نہیں کاٹ سکتا۔ رزق یہ نہیں بند کر سکتا۔ دُھوپ یہ نہیں روک سکتا۔ مینہ کی جگہ آگ یہ نہیں برسا سکتا۔ زلزلے یہ نہیں لا سکتا بجلیاں یہ نہیں گرا سکتا مگر تم ہو کہ بدحواس ہوئے جاتے ہو۔ اور ڈپٹی کمشنر کیسا تمہاری تو بیس رُوپلی کے کانسٹبل سے روح فنا ہوتی ہے۔ مگر نماز اول تو پڑھو گے نہیں اور اگر کسی کے کہنے سُننے سے شرما شرمی پڑھی بھی تو کبھی کھانستے ہو، کھنکارتے ہو، خواہ مخواہ کبھی سر کھُجاتے ہو۔ اور کچھ نہیں تو مونچھوں ہی پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ پاؤں آگے پیچھے کرنے لگے اور اِن تمام حرکات کے دوران میں خیال رہا خدا جانے کہاں کہاں۔ غرض نمازیں، تمہاری ٹکریں مارنی ہیں اور روزے تمہارے فاقے ہیں۔ رہا حج اور زکوٰۃ۔ سو اِس میں جیسی کچھ تم پوری ڈالتے ہو دُنیا کو معلوم ہے۔ بتاؤ یہ سچ ہے یا جھوٹ؟

اب بھلا میں شاہ صاحب کو کیا جواب دیتا۔ یہی کہا کہ حضور صحیح فرماتے ہیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا بڑے بڑے پیر اولیا اِس قابل نہیں کہ روح کی ماہیت کو سمجھ سکیں۔ اللہ پاک نے کلام مجید میں جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اے پیغمبر لوگ تم سے یہ پوچھیں تو تم یوں جواب دینا اور جو یہ کہیں تو تم یہ کہنا۔ مگر روح کے متعلق کہا تو یہ کہا کہ تم سے پوچھیں تو بس فقط یہ کہہ دینا کہ روح میرے اللہ کا حکم ہے۔ (قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی) بس اس سے زیادہ کچھ کہنا۔ کیونکہ تم تو

سمجھ گئے ہو میں نے تمہارا دماغ ہی ایسا بنایا ہے کہ تم ہر قسم کی باتیں سمجھ چکے ہو مگر ہر شخص کا دل و دماغ تمہاری طرح کا تو ہے نہیں۔ اگر کسی کو تم سمجھانے بھی بیٹھے تو نہ تم سمجھا سکو گے نہ وہ سمجھ سکے گا۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا اور لوگوں کو اُلٹی بدگمانی ہوگی۔ قابلیت اپنے میں نہیں کہ سمجھ سکیں اور مشہور یہ کریں کہ پیغمبر ہمیں سمجھا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کیا فائدہ۔ بس تم تو یہی کہہ دو کہ روح خدا کا حکم ہے۔ اسکی چھان بین نکرو۔ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اِسی سے مطمئن ہو جائینگے اور جو ایمان والے نہیں اُن کے آگے تو تم بال کی کھال بھی نکال کر رکھدو گے تو نہیں سمجھنے کے اور صریح ثبوت بھی دو گے جیتی جاگتی تصویریں تک دِکھا دو گے تو کہدیں گے کہ جادوگر ہے آخر دیکھ لو۔ ابوجہل نے سونے چاندی کا درخت دیکھکر کیا کہا۔ تم خود ہی دیکھو اور سوچو کہ تمہارے دُنیادار لوگ کس ذہنیت کے ہیں۔ آج سائنس کے کرشموں کی کس طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر تعریفیں کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معجزے کے طور پر کوئی ہوائی جہاز اُڑا دیتے تو سب کہتے جادوگر ہے بہت بڑا جادوگر ہے۔ لیکن آج ہوائی جہاز کو سائنس کی ترقی کا ادنٰی سا ثبوت خیال کرتے ہیں اور اُس کے موجد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اور ایک ہوائی جہاز کیا، یہ انجن، موٹر کار، ٹیلیفون، ریڈیو، لاسلکی (بغیر تار کی تار برقی) وغیرہ وغیرہ کیا چیزیں ہیں، سب عقل ہی کے تو کرشمے ہیں۔ تو کیا تم ہوائی جہاز کے کل پرزوں کو سمجھ سکتے ہو، ریڈیو کی مشینری سے واقف ہو، ٹیلیفون کی اصل و

ماہیت سے آگاہ ہو؟ اِس کا جواب تم اثبات میں ہرگز نہیں دے سکتے تو روح کی ماہیت کو جان لینا کیا ہنسی ٹھٹھا سمجھ رکھا ہے ؟ یاد رکھو یہ سارے ہوائی جہاز اور موٹریں وغیرہ انسان کی دماغی قابلیت کا نتیجہ ہیں اور روح کا علم سائنس سے کہیں ارفع و اعلیٰ چیز ہے۔ جس طرح ہر شخص ایڈیسن نہیں ہو سکتا اُسی طرح ہر شخص پیغمبر نہیں بن سکتا۔ اور ایڈیسن بنے بغیر تم سائنس کو تھوڑا بہت سمجھ بھی سکتے ہو اور ایک آدھ قسم کی ایجاد و اختراع کر بھی سکتے ہو۔ مگر روح کے سائنس کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ایڈیسن سے بہت زیادہ قابل دماغ کی ضرورت ہے۔ یہ اور علم ہے۔ سائنس اِس کے آگے لگا بھی نہیں کھا سکتا۔

میں نے شاہ صاحب کے قدموں پر گر کر عرض کی کہ حضور اب میرے دل کو تسلّی ہو گئی اور اطمینان ہو گیا۔ مجھ کو حضور نے میرے سوال کا جواب کافی و شافی دے دیا۔

Read by
Ab. Hamid Mir
M.A. (History)
Shalimar, Srinagar
[illegible]
Session:- 1983-84

کیفرِ کردار

میں نے دو شیر خنجر سے مارے ہیں۔ جی ہاں دو شیر اور خنجر سے! ۔ اور بھیڑیے تو بیسیوں مار دیئے۔ آپ یقین نہ کریں یہ دوسری بات ہے مگر میں صحیح عرض کر رہا ہوں آخر پہلے زمانے میں ایسے آدمی ہوتے ہی تھے جو تلوار یا خنجر سے شیر کا شکار کیا کرتے تھے تو مجھے بھی اِتنا عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں بھی اُن ہی کی طرح کا آدمی ہوں۔ مجھ میں کیا چیز نہیں ہے جو اُن میں موجود تھی۔ میرے ہاتھ نہیں ہیں، پاؤں نہیں ہیں، سر نہیں ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اُن لوگوں کے متعلق تو آمنّا صدّقنا کہیں اور خاکسار کی بات سُن کر مُسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ خیر آپ جانیں اور آپ کا کام۔ مگر اِتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ پہلے زمانے کے بہادر شکار کی غرض سے جنگل میں جاتے تھے اور بے شک خنجر ہی سے مار کر لاتے تھے مگر میں ...... میں ...... ہاں میں مرنا چاہتا تھا۔ اب چاہے اسے آپ من سمجھوتی سمجھیں یا حماقت، بہر حال میرا خیال تھا کہ کنوئیں میں یا دریا میں ڈوبنے سے یا پہاڑ پر سے کسی غار یا کھڈ میں چھلانگ مارنے سے یا خنجر سے اپنا گلا کاٹ ڈالنے سے میں عذابِ آخرت میں گرفتار

ہو جاؤں گا کہ خودکشی گناہِ عظیم ہے مگر اس طرح جنگل جنگل پھرنے سے کبھی کوئی شیر چیتا پھاڑ ڈالے گا مر جاؤں گا. آپ اسے بھی ارادۂ خودکشی کہہ لیجئے. خیر تو میں جنگل جنگل پھرا کرتا تھا بے شک خنجر میرے پاس ضرور ہوتا تھا. اس "کیوں" کی وجہ میں نہیں بتا سکتا. اسے ڈر کہہ لیجئے، خوف سمجھ لیجئے. بہر حال خنجر میرے پاس ضرور ہوتا تھا. اب رہا یہ سوال کہ جب مرنا ہی چاہتا تھا تو شیر کو دیکھ کر اُس کے سامنے چپ چاپ کیوں نہ لیٹ جایا کرتا، تو اس کے جواب میں فقط اتنا عرض کروں گا کہ جناب مرنا بڑا مشکل کام ہے جان کر مرنا، دیدہ و دانستہ موت کے منہ میں جانا. آپ نے شاید کبھی خودکشی کی کوشش نہیں فرمائی نہیں تو مجھے یہ باتیں کہنے کی ضرورت نہ پڑتی. حالانکہ وہ صورت اِس شکل سے بدرجہا آسان ہے جو میں نے اختیار کی تھی. پھر بھی مرنے کے ارادے سے ذرا کوئیں کے پاس جا کر تو دیکھئے اور رات کے وقت ا دیکھئے کنواں کھانے کو دوڑتا ہے یا نہیں. بھاگتے ہی بنے گی. پل پر جائیے. دریا میں چھلانگ ماریئے. پل کا کٹہرا آپ کے ہاتھوں کو مقناطیس کی طرح چپکا لے گا.

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جان کر مرنا بہت مشکل کام ہے پھر میرا اگر یہ حال ہوتا تھا کہ شیر کی دہاڑ سن کر جھاڑیوں میں چھپتا پھرتا تو کون سی تعجب کی بات ہے. ایک آدھ دفعہ ایسا ہوا کہ شیر اپنی دھن میں مست اِدھر سے آیا اُدھر نکل گیا. ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ اُس نے ہی مجھے ڈھونڈھ نکالا. اب خدا کے لئے ذرا

انصاف سے فرمایئے۔ کیا میں اُس سے کہدیتا کہ لے بھائی یہ ہاتھ ہے چبا ڈال کھا چکا؟ اچھا لے یہ دوسرا ہاتھ ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بھائی مرنا بہت مشکل ہے۔ بس جب کبھی ایسا موقعہ ہوا تو میں نہیں بتا سکتا کہ کیا ہوتا تھا اور کیونکر ہوتا تھا۔ مگر ہوتا یہی تھا کہ شیر مرا پڑا ہے، پیٹ چاک ہے، آنتڑیاں نکلی پڑی ہیں۔ میں بھی زخمی ہوتا تھا مگر کچھ زیادہ نہیں۔ بعض وقت میں یہی سوچا کرتا تھا کہ ابھی اللہ میاں کو مجھے بلانا منظور نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ آخر ایسی مصیبت کیا پڑ گئی تھی جو میں یوں مرنا چاہتا تھا' تو جناب ذرا صبر سے سُنے جایئے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہوا جاتا ہے۔

ہاں تو اسی طرح ایک دفعہ رات کو جنگل میں پھر رہا تھا۔ کوئی گیارہ بجے ہونگے کہ شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ وہ کم بخت میری ہی طرف آرہا تھا۔ وہ جگہ بھی اتفاق سے کچھ ایسی تھی کہ سوائے چھوٹی چھوٹی گھاس کے اور کچھ نہ تھا۔ درخت جو دو چار تھے بھی تو وہ کیکر کے۔ بھلا اُن پر چڑھتا کیسے؟ کانٹے چڑھنے ہی کب دیتے اور جو کانٹوں کی پیاس اپنے لہو سے بُجھا کر چڑھ بھی جاتا' تو ایسے چھوٹے سے درخت پر شیر سے کیونکر بچتا۔ میں اسی کشش وپنج میں تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں کہ اندھیرے میں اپنے سامنے ایک پُرانی عمارت دیکھی جیسے اگلے وقتوں کے مقبرے ہوتے ہیں۔ بس اُدھر تو شیر دوبارہ گرجا ہے اور اِدھر میں سر پہ پاؤں رکھکر جو بھاگا ہوں تو اُس عمارت ہی میں جا کر دم لیا۔ ابھی میرا سانس پھُولا ہی ہوا

تھا کہ میں نے اُس عمارت کے اندر کے رُخ صحن میں ایک شخص کو آتے دیکھا اب میرا اور بھی دَم فنا ہوا کہ اِدھر شیر اور اُدھر ڈاکو۔ مگر کرہی کیا سکتا تھا۔ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ بارے وہ شخص مجھ سے پَرے ہی ٹھہر گیا۔ زمین پر بیٹھا۔ کچھ کھودنے کی آواز آئی۔ پھر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں دَبے پاؤں چلا جہاں وہ شخص ٹھہرا تھا۔ وہاں پہنچ کر زمین کو دیکھا تو پولی پولی سی تھی۔ ہاتھوں سے مٹی ہٹائی تو ایک کُنجی ہاتھ میں آئی۔ اور مٹی ہٹائی تو سخت زمین آگئی۔ معلوم ہوا کہ بس یہ کُنجی ہی دبائی تھی۔ اب میرے دل میں یہ چیٹک لگی کہ یہ کُنجی کہاں کی ہے، یہاں کیوں دفن کی گئی تھی۔ چنانچہ میں ہلکے ہلکے قدم رکھتا ہوا بڑی احتیاط سے آگے بڑھا اندھیرے میں دُور سے ایک ذرا سی روشنی دِکھائی دی۔ ٹٹولتا ہوا اُسی کی طرف بڑھا قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک حوالات کی وضع کا کمرہ ہے۔ لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ موم بتی کا ایک انچ کا ٹکڑا جل رہا ہے، ایک عورت ہاتھ میں گلاس لئے سر نیچا کئے کھڑی رو رہی ہے۔ میرے پہنچتے پہنچتے اُس نے گلاس منہ سے لگا لیا میں نے جاتے ہی پہلا ارادہ پہلا کام یہ کیا کہ گلاس کو ہاتھ مارا۔ وہ چھن سے ٹوٹ کر گرا۔ اب جو اُس عورت سے میری آنکھیں چار ہوئیں تو اِدھر تو میں نے کہا "نسیمہ" اور اُدھر اُس کے منہ سے نکلا "اطہر"۔

میں نے جلدی سے قفل میں کُنجی لگائی۔ وہ کُھل گیا۔ نسیمہ بیہوش ہو گئی تھی۔ اُسے کمر پر لاد کر چُپکے چُپکے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس عمارت سے باہر نکلا۔ رات بہنے

کسی نہ کسی طرح جنگل ہی میں ایک گاؤں کے قریب گذاری۔ گرمی کا موسم تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میری نسیمہ میرے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی یا بیہوش تھی۔ بہر حال رات گذر گئی۔ صبح ہوئی۔ میں بہ مشکل تمام نسیمہ کو سہارا دیتا ہوا گاؤں میں لے گیا۔ وہاں کا نمبردار ایک ضعیف مسلمان تھا۔ بہت اچھا آدمی مجھے پہلے سے جانتا بھی تھا۔ اِس لئے کہ اِن واقعات سے بہت پہلے میں اکثر شکار کے لئے اِدھر آتا تھا تو اسی کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ نمبردار سے مختصر طور پر اپنا فرضی افسانہ بیان کیا کہ ہم دونوں میاں بیوی یکے میں فلاں جگہ جا رہے تھے۔ راستے میں چوروں نے لوٹ لیا اور سوائے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہ چھوڑا نمبردار نے ہماری خاصی خاطر تواضع کی۔ ٹھہرنے کو الگ جگہ دے دی جیسے گاؤں کے مکان کے لحاظ سے کمرہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہاں جب ذرا اطمینان و سکون میسر ہوا تو میں نے اپنی نسیمہ سے کہا۔

میں:۔ نسیمہ! میری پیاری، میری روح نسیمہ! کیا بتاؤں تمہیں زندہ وسلامت دیکھکر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ ہم سب تو تمہیں جنت الفردوس میں سمجھ رہے تھے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ تمہارے والدین کو بھی دھوکا دیا گیا بتاؤ تو سہی تم پر کیا گذری؟ میرا دل تمہاری داستان سُننے کیلئے بیتاب ہے۔

نسیمہ:۔ تم نواب ناصر سے تو واقف ہو نا؟

ناصر کا نام سُنتے ہی میرے دِل میں پنکھے لگ گئے۔ بیان نہیں کرسکتا کہ دِل کی کیا حالت ہوئی۔ اِس ایک نام سے میرے تمام جسم میں ہیجان برپا ہوگیا اِس لئے کہ ناصر وہ شخص تھا جس نے میری زندگی برباد کردی۔ نسیمہ میری رشتہ دار تو نہ تھی مگر میرے اور اُس کے والد ملازمت کے سلسلے میں ایک ہی جگہ سترہ برس تک رہے۔ اِس لئے ہم میں مثل اپنوں کے یگانگت ہوگئی۔ میرا اور نسیمہ کا بچپن ساتھ ساتھ گذرا، یہاں تک کہ ہم دونوں جوان ہوگئے۔ نسیمہ کے والد صاحب کے مزاج میں پردہ نہ تھا۔ اِس لئے ہم جوان ہونے کے بعد بھی ساتھ ہی ساتھ رہے بچپن کی بھولی بھالی اور معصوم محبت بڑھتے بڑھتے عشق کی شکل میں رونما ہوئی۔ میری دُنیا جنت الفردوس بنی ہوئی تھی۔ میں مجسّم خوشی بنا ہوا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں خوشی میں کھوگیا تھا، گُم ہوگیا تھا، فنا ہوگیا تھا۔ اُف کیا دن تھے اور کیا زمانہ تھا۔ ہمارے شہر سے بائیس میل کے فاصلہ پر قصبہ دلدار نگر تھا جہاں نواب ناصر رہتے تھے۔ اِن کو گورنمنٹ سے نہایت معقول اور گرانقدر وثیقہ ملتا تھا۔ معلوم نہیں نوابی کا خطاب بھی گورنمنٹ کا عطا کردہ تھا یا نہیں! بہرحال وہ کہلاتے نواب ناصر ہی تھے۔ شکار کے سلسلے میں اکثر ہمارے ہاں بھی آتے رہتے تھے۔ میں نے اِس شخص کو جب پہلے پہل دیکھا تو اپنے دل میں اُس کی طرف سے نفرت اور ایک خاص قسم کا جذبہ محسوس کیا جس کی تشریح کرنے سے میں قاصر ہوں۔ برخلاف اس کے یہ شخص مجھسے بلکہ میرے دوستوں تک سے

نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملتا اور کچھ اِس خلوص و محبت سے بات چیت کرتا کہ
میں اپنے دل میں خود ہی قائل ہو جاتا اور پشیمان ہو کر رہ جاتا۔ دیکھنے میں دُبلا پتلا کمزور
سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے ہاتھ پاؤں والا شخص شیر
چیتوں کا کیونکر شکار کرتا ہوگا۔ مگر اُس کے متعلق سُنتا یہی رہتا تھا کہ اسے شیر ہی
کے شکار کا شوق ہے۔ اِسے اتفاق سمجھیے یا قسمت کی خوبی کہ میرے والد صاحب
نے مجھے کسی کام سے مرزا پور بھیجا۔ چنار گڈھ وہاں سے قریب ہی ہے۔ بہت
تعریف سُنی تھی کہ جگہ دیکھنے کے قابل ہے۔ نہایت ہی پُر فضا مقام ہے۔ چنانچہ
اپنے کام سے فارغ ہوا تو کہا لاؤ چنار گڈھ کی بھی سیر کرتا چلوں۔ میرا وہاں جانا ستم
ہو گیا۔ پہاڑی کی سیر کر کے واپس آرہا تھا کہ چند ڈاکوؤں نے آن گھیرا۔ آنکھوں
پر پٹی باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اُن کے سردار نے میرا نام پوچھا۔ پھر مجھ سے
کہا کہ اپنے والد صاحب سے دو ہزار روپے منگوا دو جب تمہیں چھوڑوں گا
مختصر یہ ہے کہ جس طرح اُس نے کہا میں نے والد صاحب کو خط لکھ کر اُسے
دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ قید
محض سمجھنی چاہیئے۔ پڑھنے اور وقت گذارنے کے لئے رسالے اخبار
اور کتابیں مجھے دی جاتی تھیں۔ کھانا نہایت اچھا ملتا تھا۔ بس اُس مکان سے
باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ تین دن میرے خاصی طرح گذرے۔ چوتھے دن دوپہر
کا کھانا کھانے کے بعد سر چکراتا ہوا معلوم دیا۔ کچھ درد محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ ایسا

معلوم ہونے لگا۔ جیسے کوئی ٹھہر ٹھہر کر دماغ پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔ آدھے گھنٹے تک یہ حالت رہی۔ پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ اماں جان بلائیں لے رہی ہیں اور رو رہی ہیں۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ کپڑے پھاڑتا تھا۔ آپ ہی آپ ہنستا، کبھی روتا، کبھی کودتا، اُچھلتا ناچتا، گاتا، کسی کو گالیاں دیتا، کسی کو مارتا۔ غرض خاصا خوفناک پاگل تھا۔ اسی حالت میں میرے والد صاحب کے ایک دوست مجھے پکڑ کر گھر لائے۔ چار مہینے تک میری یہی حالت رہی۔ حکیموں ڈاکٹروں کا علاج ہوا مگر کسی کی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔ پرسوں ایک فقیر صاحب تشریف لائے تھے۔ والد صاحب نے اُن سے سب حال کہا۔ اُنھوں نے کچھ گولیاں دی تھیں۔ وہ گولیاں کیا تھیں اکسیر تھیں کہ دو ہی دن میں میں تندرست ہوگیا۔

میں نے جو یہ سُنا تو حیرت میں رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکوؤں کے گھر میں بیمار پڑا اور پاگل ہوا لیکن یہاں اپنے شہر میں کون بھلا مانس پہنچ گیا اور وہ فقیر صاحب کون بزرگ تھے۔ غرض کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میری صحت یابی پر خوشیاں منائی جانے لگیں مگر مجھے اِس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو اپنی جان سے پیاری نسیمہ سے ملنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ فوراً اُس کے بنگلے پر گیا۔ سامنے تو تھا ہی۔ مشکل سے کوئی تین فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ خیر وہاں جو پہنچا تو نسیمہ کے والد صاحب دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے۔ اُٹھ کر آئے اور گلے سے

چھٹا لیا۔ میرے تو دل کو لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک بات چیت کرنے کے بعد میں نے پوچھا:۔

"چچا صاحب! نسیمہ بیگم کہاں ہیں؟"

چچا صاحب:۔ بیٹا وہ تو اپنی سُسرال گئی۔

میں:۔ (حیرت سے) سُسرال؟ کیسی سُسرال؟

چچا صاحب:۔ شاید تمہیں معلوم نہیں۔ ہاں سچ تو ہے تمہیں کیا معلوم ہوتا۔ تم تو بیمار تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید بھابی (میری والدہ) نے تم سے کہہ دیا ہوگا۔

میں:۔ (جلدی سے) جی نہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کسی نے مجھسے نہیں کہا مہربانی کرکے جلدی بتائیے معاملہ کیا ہے؟

چچا صاحب:۔ بیٹا تم تو کچھ گھبرا سے گئے۔ آخر اِتنے پریشان ہونے کی کیا وجہ ہے؟

میں:۔ (اپنے دل پر بمشکل تمام قابو پاکر) جی نہیں۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ خبر میرے لئے ذرا نئی تھی اِس وجہ سے حیرت ضرور ہے۔

چچا صاحب:۔ نواب ناصر کو تو تم جانتے ہو نہ؟

میں:۔ (جلدی سے) ہاں۔ ہاں۔ جی ہاں۔

چچا صاحب:۔ مہینہ بھر کا عرصہ ہوا اُس کی شادی نواب ناصر سے ہوگئی اور اب وہ اپنی سُسرال میں ہے۔

میں اِس خبر سے کچھ ایسا بدحواس ہوا کہ اُٹھکر سیدھا بھاگا۔ چچا صاحب

پکارتے ہی رہ گئے۔ میاں ٹھہرو تو، میاں ٹھہرو تو! مگر میں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا وہ غالباً یہی سمجھے ہوں گے کہ اِس پر پھر جنون کا دورہ پڑا۔ گھر پہنچ کر سیدھا اماں جان کے پاس پہنچا۔ وہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ پاس ہی میری چھوٹی بہن کلثوم بھی بیٹھی تھی میں نے جاتے ہی کہا:۔

"اماں جان! کیا یہ سچ ہے کہ نسیم کی شادی ہو گئی ہے؟"

اماں جان:۔ ہاں کوئی مہینہ بھر ہوا۔

میں:۔ کیسے ہو گئی؟

اماں جان:۔ بیٹا ہوش میں آ۔ کیسی باتیں کرتا ہے۔ ارے اُس کے ماں باپ نے کر دی ہو گی۔

میں:۔ مگر..... مگر..... کلثوم ذرا یہاں آنا۔

کلثوم کو لیکر اپنے کمرے میں آیا اور جلدی سے پوچھا

"کلثوم! خدا کے لئے تو ہی بتا یہ معاملہ کیا ہے؟"

کلثوم:۔ بھائی میں کیا بتاؤں۔ نسیمہ کی شادی نواب ناصر سے ہو گئی بس۔

میں:۔ کلثوم تو میری چھوٹی بہن ہے۔ تجھ سے مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں مگر دیکھ۔ یہاں ہاتھ رکھکر دیکھ۔ میرا دل بلیّوں اُچھل رہا ہے۔ اب بھی تو سمجھی یا نہیں؟

کلثوم:۔ ہاں بھائی سمجھ تو گئی مگر ہم میں سے کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ تھی کہ آپ کو

آپا نسیمہ سے عشق تھا۔

میں :۔ (جلدی سے) عشق! کلثوم میری دنیا اجڑ گئی۔ میں تباہ ہوگیا۔ میری زندگی برباد ہوگئی۔ عشق کس جانور کا نام ہے۔ نسیمہ میری رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور ہے۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

کلثوم :۔ (کچھ سوچ کر) مگر...... مگر...... اب...... کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نے اِس کا کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ کم سے کم مجھ ہی کو کسی طرح معلوم ہو جاتا تو میں ہی کچھ کوشش کرتی۔ اور کوشش کیا؟ آپ کے ساتھ آپا نسیمہ کی شادی کرنے میں نہ ہمارے والدین کو کوئی عذر ہو سکتا تھا اور نہ اُن کے مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

میں :۔ لیکن یہ ایسے جلدی ہو کیسے گئی شادی؟

کلثوم :۔ نواب ناصر نے پیغام دیا۔ آپا نسیمہ کے والدین نے خوشی سے منظور کر لیا۔ نواب ناصر نے جلدی کی اور کہا مجھے جہیز وغیرہ کچھ نہیں چاہیئے۔ پھر بھی تین مہینہ تک آپا نسیمہ کے والدین نے خاصی تیاری کی اور پھر شادی کر دی۔

میں :۔ اور میں کہاں تھا اُس وقت؟

کلثوم :۔ آپ لوگوں کو کاٹتے تھے، مارتے تھے۔ رسیوں سے بندھے رہتے تھے۔

میں :۔ کلثوم! ایک بات تو بتاؤ۔

کلثوم :۔ کونسی بات ؟

میں :۔ نسیمہ تمہاری سہیلی تھی ۔ اوّل تو اُس نے ہماری آپس کی محبت کا حال تم سے کچھ نہ کچھ ضرور بیان کیا ہوگا۔ نہیں تو کم سے کم تمہیں اِتنا تو ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ شادی اُس کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے ۔ افسوس ! اُس غریب نے محض والدین کی فرماں برداری کر کے اپنی زندگی تباہ کر ڈالی ۔

کلثوم :۔ واہ بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ اُن کے والد بڑے روشن خیال آدمی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نئی تہذیب کے دلدادہ ۔ اُنہوں نے میری ہی معرفت آپا نسیمہ کی مرضی دریافت کروائی تھی ۔

میں :۔ (جلدی سے) ہاں تو اُنہوں نے اُس وقت تم سے ضرور ہماری محبت کا ذِکر کیا ہوگا ۔

کلثوم :۔ مطلق نہیں ۔ بلکہ اُنہوں نے اپنی خوشنودی ظاہر کی ۔

میں :۔ تم نے اُس وقت اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تھا ؟ افسوس کلثوم تُو نہ سمجھ سکی کہ ادائے فرض کے جذبہ نے اُس کے جذباتِ محبت کو مغلوب کر دیا تھا ۔

کلثوم :۔ اے بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ آپ ہیں کس خیال میں ۔ اُنہیں نواب ناصر سے عشق تھا ۔ اُنہوں نے اِس کا میرے سامنے اعتراف کیا ۔

میں :۔ (جلدی سے) کلثوم کیا کہتی ہو ، کیا کہہ رہی ہو ؟

کلثوم :۔ بھائی میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں نواب ناصر کی محبت کو پڑھ لیا تھا

یہ سنتے ہی میں دِل تھام کر بیٹھ گیا۔ مجھے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ نسیمہ کو، میری جان سے پیاری نسیمہ کو نواب ناصر سے کسی طرح کسی صورت میں محبت ہو بھی سکتی تھی۔ اِس میں ضرور اُس دغاباز اور کمینے ناصر کی کوئی شعبدہ گری ہوگی اور اب جو دماغ پر زور ڈالا تو صاف سمجھ میں آگیا کہ مجھے اوّل دِن سے ناصر سے اللہ واسطے کا بَیر کیوں تھا۔ اُس کی شکل دیکھ کر دِل میں خودبخود نفرت کے جذبات کیوں بھڑک اُٹھتے تھے۔ حالانکہ وہ نہایت ہی اخلاق سے مجھسے مِلتا جُلتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ پرلے درجے کا بدمعاش اور شریر النفس تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح سے یہ جان لیا تھا کہ نسیمہ کو مجھسے محبت ہے اور میری موجودگی میں اُس کی دال نہیں گلنے کی اب اِس وقت میری عقل پر سے پردہ اُٹھ گیا اور میں گزشتہ واقعات کو اِس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی بائسکوپ میں تماشا دیکھتا ہے۔ میں جلدی سے اباجان کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا :۔

میں :۔ اباجان ! میں نے چنار گڈھ سے ایک خط آپ کو بھیجا تھا۔ آپ کو مِل گیا تھا؟

اباجان :۔ نہیں تو کب لکھا تھا؟

میں :۔ میں جب مرزاپور گیا تھا تو دو ایک روز کے لیے چنار گڈھ بھی گیا تھا۔ وہاں مجھے کچھ روپے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ چنانچہ ایک شخص کے ہاتھ آپ کو وہ

خط بھیجا تھا۔

اباجان، میرے پاس کوئی شخص تمہارا خط نہیں لایا۔ کیوں تمہیں روپے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟

"جی کچھ نہیں" کہکر میں چلا آیا۔ اب اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا کہ چار گڈھ میں مجھے ڈاکوؤں نے نہیں بلکہ نواب ناصر ہی کے آدمیوں نے پکڑا تھا اور وہیں مجھ کوئی ایسی دوا کھانے میں دے دی جس نے میرے دماغ کو ماؤف کر دیا۔ وہی لوگ مجھے دیوانہ بنانے کے بعد میرے شہر میں چھوڑ گئے۔ جب تک ناصر کی شادی نسیمہ سے نہ ہو گئی مجھے پاگل بنائے رکھا۔ جب اُس کا کام نکل گیا تو فقیر کے بھیس میں اُس کا کوئی آدمی آ کر مجھے کچھ گولیاں کھلا گیا جس سے اُس پہلی دوا کا اثر جاتا رہا اور میں تندرست ہو گیا۔

اب یہ ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔ میرا خون کھول گیا مگر بے بس تھا کوئی ثبوت نہیں۔ کوئی گواہ نہیں۔ کر ہی کیا سکتا تھا۔ رات دن ناصر سے انتقام لینے کے منصوبے سوچا کرتا تھا مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بن نہ پڑتی۔ اور خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا۔ اسی فکر و پریشانی اور کوفت میں تین مہینے گذر گئے۔ ایک دن نسیمہ کے ہاں کی ملازمہ شریفن روتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "ہماری چھوٹی بیگم تو جنت کو سدھاریں" چھوٹی بیگم کا نام سُنتے ہی میرے کان کھڑے ہوئے۔ مُڑ کر پوچھا:۔

میں :۔ شریفن ! کیا کہہ رہی ہو ۔ کون چھوٹی بیگم ؟

شریفن :۔ (روتے ہوئے) اے میاں تم ہماری چھوٹی بیگم نسیمہ بی کو بھول گئے ۔ ہائے اُن کی اماں تو پچھاڑیں کھا رہی ہیں ۔

میں :۔ خدا کے لئے شریفن صاف کہو بات کیا ہے ؟

شریفن :۔ اے میاں کل دولہا میاں کے ہاں سے آدمی خط لایا تھا ۔ بڑے سرکار پڑھتے ہی بے اوسان ہو کر گھر میں آئے ۔ لکھا تھا کہ نسیمہ بی کو نمونیہ ہو گیا ہے حالت نازک ہے ۔ بڑے سرکار کو بلایا تھا ۔ بس گھر میں بڑی بیگم سے کہا اور فوراً اُسی آدمی کے ساتھ دلدار نگر چلے گئے ۔ یہاں کل سے اِس وقت تک کسی کے منہ میں کھیل تک اُڑ کر نہیں گئی ۔ بڑی بیگم نے پہاڑ سی رات آنکھوں میں کاٹی ۔ آج ابھی ابھی بڑے سرکار واپس آئے ہیں ۔ بس میاں کیا کہوں گھر ویران ہو گیا ۔

یہ کہہ کر رونے لگی ۔ میں اِس خبر وحشت اثر کو سُنتے ہی سراسیمہ ہو کر بھاگا اور سیدھا چچا جان کے پاس پہنچا ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بلبلا کر اُٹھے اور جھپٹ کر ایسا روئے کہ ہچکی بندھ گئی ۔ میں بھی چیخیں مار مار کر رو رہا تھا ۔ اِسی حالت میں مجھے لئے اندر پہنچے ۔ وہاں چچی بھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا :۔

"چچا صاحب ! خدا کے لئے فرمایئے تو یہ ہوا کیا ؟

چچا صاحب :۔ بیٹا کیا بتاؤں۔ کیونکر کہوں نسیمہ مجھ سے روٹھ گئی۔ (بیوی سے) بیگم اب اِس سے کس طرح کہوں۔ تم ہی کہہ دو۔

اِتنا کہہ کر چچا صاحب رونے لگے۔ میں ہکا بکا ہو کر کبھی چچا صاحب کو دیکھتا تھا اور کبھی چچی جان کو۔ دونوں رو رہے تھے۔ اِدھر میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ ایک ایک منٹ نو بھر ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ذرا دل قابو میں ہوا تو چچا صاحب نے کہا:۔

چچا صاحب :۔ بیٹا! یہاں سے تو بھلی چنگی گئی تھی۔ پچھلے بدھ کو خط آیا کہ معمولی بخار ہے پریشانی کی بات نہیں جاتا رہے گا۔ کل آدمی خط لایا کہ نمونیہ ہو گیا ہے حالت نازک ہے۔ جلدی آیئے۔ میں بے اوسان ہو کر بھاگا ہوا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو ختم بھی ہو چکی تھی۔ کل شام ہی کو دفن بھی کر دیا۔

میں :۔ (جلدی سے) آپ نے شکل بھی دیکھی تھی؟

چچا صاحب :۔ ہاں کیوں نہیں دیکھی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا سو رہی ہے۔ بیٹا! میرا تو گھر ہی برباد ہو گیا۔ اس صدمہ نے کمر توڑ دی۔ بیگم خود ہی بیمار رہتی ہیں اب اس سانحۂ ہوش ربا نے اُن کو اور بھی زندہ درگور کر دیا۔ کوئی اور اولاد نہیں کہ اُسی کو دیکھ کر صبر آ جاتا۔

مجھے رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں اِس میں بھی اُس عیار دغا باز نام کی شرارت نہ ہو۔ مگر کسی بات پر خیال جمتا ہی نہ تھا۔ دل میں کہتا تھا کہ اول تو نسیمہ

فرشتہ تھی اور اگر بفرضِ محال ناصر کو اُس سے اِتنی جلدی نفرت ہو بھی گئی تھی تو اُسے مارنے کی کیا ضرورت تھی. باپ کے گھر بھجوا دیتا. یا طلاق ہی دیدیتا. کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا کیونکر ہوا.

اِدھر میں اپنے خیالات میں محو تھا اُدھر چچی جان اور چچا صاحب گردن جھکائے عالمِ استغراق میں تھے. دونوں کو اِسی حالت میں چھوڑ کر بغیر سلام کئے وہاں سے چلا آیا. اپنے گھر نہیں گیا. ایک جوہڑ کے کنارے بیٹھ کر سوچتا رہا سوچتا رہا. مجھے خبر نہیں کب سورج چھپا اور کب شام ہوئی. جب سر اُٹھا کر دیکھا ہے تو تارے نکل رہے تھے. دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر آہیں بھرتا ہوا گھر آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر دھڑ سے گر پڑا. والدہ آئیں. اُن سے مختصر طور پر حال کہہ دیا. انہیں بھی بہت ہی افسوس ہوا. کھانا کھانے کیلئے بیحد اصرار کیا مگر یہاں بھوک ہی کسے تھی. کھانے کے نام سے جی متلاتا تھا. اماں جان نے کلثوم کو بھیجا. وہ میرے برابر پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی.

کلثوم:۔ بھائی! مجھے آپ کے غم و الم کا پورے طور پر احساس ہے مگر یہ تو سوچیے کہ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں. مشیتِ ایزدی یہی تھی. اللہ کا حکم یونہی تھا. اب سوائے صبر کے چارہ ہی کیا ہے؟

میں نے کچھ ایسی نگاہ سے کلثوم کو دیکھا کہ وہ بیتاب ہو کر مجھ سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی:۔

کلثوم :- اچھی بھائی! صبر کیجئے. آپا نسیمہ تو اب آ نہیں سکتیں. اُن کے ماں باپ کا جو کچھ حال نہ ہو تھوڑا ہے. ہمارے گھر میں بس ایک آپ ہیں یا میں ہوں. آپ بھی اب سے دُور جو بیمار پڑے تھے تو اب تک وہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں چلا ہی جاتا ہے. ابّا جان بھی آپ کی طرف سے بہت ہی پریشان رہتے ہیں. اور امّاں جان تو دیوانی سی ہو رہی ہیں. خدا نہ کرے دشمنوں کے کان بہرے اگر آپ کے دشمنوں کو پھر کچھ ہو گیا تو مجھے خیر جانے دیجئے، امّاں جان اور ابّا جان کا کیا حال ہو گا. اچھی میرے بھائی جان! اب نہ روئیے اپنے دل کو سنبھالیے.

میں :- کلثوم :- نسیمہ میری قسمت میں نہ تھی، میرے لئے نہ تھی مگر جیتی رہتی اور خوش رہتی. میرے لئے یہی بہت تھا. میں اپنی زندگی اس بات کے لئے وقف کر دیتا کہ وہ اپنے گھر میں عزّت کے ساتھ خوش و خرم رہے. اُس کا میاں اُس کے ساتھ سلوک و محبت سے رہے. اگر وہ اُس سے کبھی بُرا برتاؤ کرتا تو میں اُس کو مجبور کرتا، دباتا، اُس کی منت خوشامد کرتا، جھڑکیاں سُنتا، گالیاں کھاتا. مگر اپنی نسیمہ کی بہبودی اور خوشی کے لئے جان لڑا دیتا. مگر اب....

اب...... کلثوم...... بتا...... بتا...... اب کیا کروں؟ کیسے جیوں، کِس کے لئے جیوں؟

کلثوم :- بھائی! آپ کو جینا پڑیگا. امّاں کے لئے، ابّا کے لئے، میرے لئے

آپ کی زندگی تو بے کیف ہو ہی گئی مگر للہ ہم تینوں پر رحم کیجئے۔ خیال بتائیے ہر وقت ایک ہی خیال دل میں رہے گا تو آپ کے دشمن پھر بیمار پڑ جائیں گے۔

میں:- کلثوم! تم اِسے معمولی "خیال" سمجھتی ہو۔ میری طاقت میں ہوتا تو اس خیال کو اُسی وقت دِل سے نکال دیتا جب نسیمہ کی شادی کا حال معلوم ہوا تھا مگر یہ "خیال" ایسا خیال ہے جو میری رگ رگ میں اثر کر چکا ہے۔ رس بس چکا ہے اور اب اس کا الگ کرنا میرے بس کی بات نہیں

اس کے بعد میں اپنے عزیزوں کی نگاہ میں پھر پاگل بن گیا مگر حقیقت میں پاگل نہ تھا۔ ہاں گُم سُم تھا۔ نہ کسی سے بولتا تھا نہ چالتا تھا۔ دو دن تک یہی کیفیت رہی۔ پھر سوچا کہ اب تو زندگی میرے لئے ایک بیکار سی شے ہو کر رہ گئی ہے اسے ختم ہی کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ گھر سے نکل گیا۔ جنگل جنگل پھرتا رہا۔ دسویں دن میری نسیمہ مجھے مل گئی جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔

نسیمہ:- تم نواب ناصر سے تو واقف ہو نہ؟

میں:- ہاں واقف ہوں اور اچھی طرح واقف ہوں۔

یہ کہکر میں نے اُسے اپنا چنار گڑھ میں ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنسنا، پاگل بننا، چار مہینے کے بعد تندرست ہونا، نسیمہ کی موت کی خبر اور اپنا زندگی

سے بیزار ہو کر مرنے کے ارادے سے جنگل جنگل پھرنا۔ غرض سارے حالات تفصیل کے ساتھ سُنائے جنہیں سُن کر وہ جلدی سے بولی:۔

نسیمہ:۔ اے ہے میری اماں جان اور ابا جان مجھے مُردہ سمجھ رہے ہیں؟ ہائے اُن کا میرے غم میں کیا حال ہوا ہو گا۔

میں:۔ اچھا اب تم اپنی کہانی سناؤ کہ تم پر کیا بیتی اور تم اُس قید خانے میں کیسے پہنچیں؟

نسیمہ:۔ تمہارے بیمار پڑنے کے بعد نواب ناصر ہمارے ہاں اکثر آنے جانے لگے اُن کی زبان میں کچھ ایسا جادو اور آنکھوں میں ایسا سحر تھا کہ جو دیکھتا اور اُن کی باتیں سُنتا مسحور ہو کر رہ جاتا۔ ابا جان نہایت آزاد خیال آدمی ہیں اور پردے کے سخت مخالف' اس لئے میں بھی نواب ناصر کی باتیں سُنا کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر شیر چیتوں کے شکار کے ہی قصے سُنایا کرتے تھے۔ اُن کی بہادری، دلیری اور شجاعت کے کارنامے سُن سُن کر میرے بدن میں سنسنیاں سی آتی تھیں اور روح اُن کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔ پھر اُن کا اخلاق اور طرزِ گفتگو بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ ہر شخص اُن کا گرویدہ ہوا چلا جاتا تھا۔ میں کم سن تھی اور ناتجربہ کار۔ اُن کی جادو بیانی نے اور شجاعت نے میری عقل پر پتھر ڈال دیئے۔ مختصر یہ ہے کہ میں سمجھنے لگی کہ مجھے اُن سے محبت ہی نہیں عشق ہے۔ تین مہینے کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔ میں نواب صاحب کے

ساتھ دلدار نگر چلی آئی. یہاں مجھے ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا. نوکر چاکر زیور. کپڑے. اچھے سے اچھے کھانے. مگر یہاں آکر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گھڑی گھڑی میرے دل کو ٹھوکے دے دیکر کہتا ہے کہ یہ شخص وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے. اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں. ادھر نواب صاحب کو دیکھا تو خاطر مدارات میں تو کوئی کمی نہ تھی. مگر اُس محبت کا نام و نشان بھی نہ تھا جو شادی سے پہلے جتائی جاتی تھی. زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے یا دیوان خانے میں کچھ لوگوں کے ساتھ. میں کبھی چُپ چاپ دبے پاؤں اُن کے کمرے میں جا پہنچتی تو مجھے دیکھکر اُچھل پڑتے اور کچھ ناراضگی و برہمی کے آثار اُن کے چہرے سے ظاہر ہونے لگتے مگر وہ فوراً مسکرانے لگتے اور باتیں کرنے لگتے. میں یہ ضرور سمجھ جاتی کہ میرا آنا انہیں ناگوار ہوا اور یہ سوچکر دل میں گڑھا کرتی کہ آخر اِن کی وہ محبت کیا ہو گئی. کچھ عرصہ کے بعد یہ حالت ہوئی کہ پانچ پانچ چھ چھ دن گھر سے غائب رہنے لگے. میں پوچھتی تو کہہ دیتے کہ زمینداری فلاں فلاں جگہ ہے مجھے اُس کی دیکھ بھال کے لیئے جانا ہی پڑتا ہے.

ایک دن سہ پہر کو میں اُن کے ساتھ موٹر میں ایک جگہ سیر کو گئی جگہ دور تھی خاصی کوئی پچیس تیس میل. ہمیں شام وہیں دریا پر ہی ہو گئی تھی. موٹر پاس تھی ہی اس لیئے کچھ فکر نہ تھا. خیر وہاں سے واپس ہوئے. کوئی

ڈیڑھ ہی میل چلے ہوں گے کہ موٹر بگڑ گئی۔ اُسے ٹھیک کرنے میں دو گھنٹے لگ گئے مگر وہ درست نہ ہوئی۔ رات خاصی آگئی تھی۔ نواب صاحب نے کہا کہ اب اِس وقت کوئی سواری بھی نہیں اور گھر بہت دور ہے۔ یہاں سے قریب ہی پُرانی گڑھی ہے وہاں کے جاگیردار میرے دوست ہیں چلو رات وہیں چل کر گذاریں صبح کو کچھ انتظام ہو جائے گا۔ کوئی آدھے یا پَون میل کا فاصلہ ہو گا۔ میں پیدل چلی گئی۔ کھانا وانا کھا چکنے کے بعد نواب صاحب نے کہا کہ میں جاگیردار صاحب کے کمرے میں سوؤں گا اُن سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تم اِس کمرے میں سو رہو ڈرنا نہیں۔ نوکر چاکر موجود ہیں اور جب کسی کو بلانے کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی ہے اِسے بجا دینا ملازم آجائینگے۔

یہ کہکر نواب صاحب چلے گئے۔ میں پلنگ پر لیٹ گئی مگر نیند نہ آئی۔ پڑی پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ کمرے کے ایک کونے میں کتابوں کی الماری تھی۔ یعنی دیوار میں الماری بنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لاؤ کوئی کتاب ہی پڑھو۔ ایک کتاب وہاں سے لائی۔ دو چار صفحے پڑھے۔ دل نہیں لگا۔ اُسے رکھکر دوسری لائی۔ وہ بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اُسے بھی رکھنے گئی۔ اُس کے برابر والی کتاب لینے لگی تو جلد ایک چھوٹے سے کواڑ کے مانند کھُل گئی جس کے پیچھے ایک ذرا سا طاق سا نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ طاق کو چھُپانے کے لئے کتاب کی جلد کی شکل کا کواڑ لگا دیا ہے تاکہ دیکھنے والے کو کتاب ہی نظر آئے

عمارت چونکہ بہت پرانی تھی اور میں اکثر کتابوں میں اس قسم کی باتیں پڑھ بھی چکی تھی کہ خفیہ راستے پرانی عمارتوں میں اکثر ہوتے ہیں جو بالکل پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ اشتیاق سا ہوا کہ دیکھوں تو سہی اس طاق میں کوئی خزانہ ہے یا کیا چیز ہے جو اسے چھپانے کے لئے اتنی احتیاط برتی ہے طاق کو دیکھا تو بالکل خالی تھا۔ انگلیاں اس کے اندر دائیں بائیں اوپر نیچے چلائیں تو طاق کی پشت کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور ذرا سا زور لگایا تو وہ حصہ ایک جانب ہٹ گیا اور اس کے پیچھے ذرا سا خلا دکھائی دیا۔ وہاں ہاتھ ڈالا تو ایک بٹن سا ہاتھ کے نیچے آیا۔ اسے دبایا تو نہ دبا۔ آگے پیچھے کھسکایا تو اپنے پیچھے کی سمت کچھ کھٹکا سا ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو دیوار کا کچھ حصہ دیوار ہی میں جذب ہو کر ایک جانب ہو گیا اور خاصی کھڑکی سی بن گئی۔ مجھے اس کے اندر جاتے ہوئے ڈر بھی لگا مگر ساتھ ہی شوق بھی چرایا کہ چل کر دیکھوں تو اس میں کیا ہے۔ آخر ہمت کر کے اس کھڑکی میں سے ہو کر دوسری طرف گئی۔ دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف کی دیواروں کو ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی۔ پانچ چھ قدم چل کر دائیں جانب ایک دروازہ سا معلوم دیا۔ اس میں گئی تو سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اوپر چڑھ گئی تو سامنے سے روشنی کی پتلی سی لکیر دکھائی دی۔ وہاں گئی تو معلوم ہوا کہ ایک کمرہ ہے جس کے کواڑ بند ہیں۔ جھری میں سے جھانک کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ چھ آدمی ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے

ہوئے تھے۔ میری آنکھوں کے بالکل سامنے نواب صاحب ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایک عورت نہایت ہی حسین وجمیل سامنے کھڑی رو رہی تھی۔ میں پہلے تو یہ سمجھی کہ نواب صاحب اوباش وآوارہ ہیں۔ لڑکیوں کو کسی نہ کسی طرح دھوکے سے اُن کے گھروں سے بلوا لیتے ہیں اور اپنا منہ کالا کرتے ہیں گھر سے دِنوں اسی لئے غائب رہتے ہیں اور مجھ سے جائداد اور زمینداری کی دیکھ بھال کا بہانہ کر دیتے ہیں۔ مگر فوراً ہی یہ خیال دُور ہو گیا۔ اِس لئے کہ اُن میں سے ایک شخص نے کہا۔

ایک۔ سردار! یہ میرا حق ہے۔ پچھلی دفعہ آپ نے وہ عورت محبوب کو دلوادی۔ اِس کے پاس تو چھ موجود ہیں۔ آپ میری حق تلفی نہ کیجئے۔

محبوب۔ سردار! یہ بھگوانا یونہی لڑا کرتا ہے۔ محنت میں نے کی۔ اپنی جان پر کھیل کر اسے میں لایا اور یہ خواہ مخواہ اپنا حق جتانے لگا۔ واہ خوب رہی۔

اِتنا سُنتے ہی بھگوانا نے محبوب کے مُکّا مارا۔ دونوں آپس میں گتھ گئے نواب صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔

”خبردار! چھوڑو ایک دوسرے کو۔“

اُن کی آواز سُن کر دونوں سہم کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب بولے۔

نواب صاحب۔ میں ان آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں۔ تم لوگ نہایت

ہی بیوقوف اور گدھے ہو جو اِتنا بھی نہیں سمجھتے کہ عورت جیسی حقیر چیز پر جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ یہ فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ عورت ہی کی وجہ سے مَردوں پر آئے دِن مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اور خاصکر ہمارے پیشے کے لئے تو عورت کا وجود نہایت ہی مضرت رساں ہے۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ آیندہ کسی ڈاکے میں اگر کوئی عورت ملے تو اُسے یا تو مار ڈالنا یا چھوڑ کر چلے آنا۔ اپنے ساتھ ہرگز نہ لانا۔

محبوب:۔ سردار! ہم آپ کا حکم آنکھوں سے بجالائینگے مگر اب تو یہ عورت مجھے بخش دیجیئے۔

بھگوانا:۔ نہیں سردار ایسا نہ کیجیئے گا۔ یہ مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔

اُسی وقت پستول کی آواز آئی۔ عورت چیخ مار کر گری اور نواب ناصر نے کہا "لو میں نے اس قصے ہی کو ختم کر دیا"۔

اُدھر تو وہ عورت چیخ مار کر گری اور اِدھر میرے منہ سے ڈر کے مارے زور سے چیخ نکلی۔ جیسے سُنتے ہی نواب صاحب اور دو تین آدمی لپک کر دوڑے۔ دروازہ کھولا تو مجھے دیکھا۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ نواب صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئے اور بولے:۔

نواب صاحب:۔ بیگم صاحبہ! آپ اِس وقت رات کے بارہ بجے یہاں کیا کر رہی تھیں اور یہاں تک پہنچیں کیسے؟

میرا ڈر کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اور یوں بھی بھلا میں کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ تمام بدن میں لرزہ تھا اور میں چپ تھی۔ نواب صاحب میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ میرا دم فنا ہوئے جا رہا تھا۔ اُن کی نظریں میرے دل کے پار ہوئی جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب کڑک کر بولے:۔

نواب صاحب:۔ نسیمہ تمہیں بتانا پڑیگا۔ جلدی بولو۔

میں نے سب حال سچ سچ بیان کر دیا۔ نواب صاحب خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب میں کہہ چکی تو بولے:۔

نواب صاحب:۔ اب اتنا اور بتا دو کہ تمہارا ہم سب لوگوں کے متعلق کیا خیال ہے۔ دیکھو سچ سچ بتانا۔

میں:۔ یہ سب ڈاکو ہیں اور آپ ان کے سردار ہیں۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ آپ آٹھ آٹھ دن تک کیوں گھر سے غائب رہا کرتے ہیں

نواب صاحب:۔ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ تم بہت عقلمند عورت ہو۔

اس کے بعد نواب صاحب نے اپنے ساتھیوں سے کہا:۔

نواب صاحب:۔ میرے دوستو! تم نے دیکھا میری پیشینگوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی۔ ابھی ابھی میں نے کہا تھا کہ عورت کا وجود ہمارے پیشے کیلئے سخت مضرت رساں ہے۔ دیکھو اس عورت سے زیادہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا

تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ یہ میری بیوی ہے ہاں بیوی ہے اور مجھے اس سے خاصی محبت بھی ہے مگر محبت سے ضروری چیز اپنی زندگی کی حفاظت ہے اور نہ صرف اپنی بلکہ تم سب کی بھی۔ لہذا میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ اس کے متعلق اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

سب نے تھوڑی دیر تک آپس میں چُپکے چُپکے باتیں کیں۔ پھر ایک زبان ہوکر کہا کہ اسے "اندھے تہہ خانے" میں قید کردیجیئے۔

نواب صاحب: تم نے اپنے فیصلے میں اس بات کو مد نظر رکھا ہے کہ یہ میری بیوی ہے میں تمہارے اِس جذبے کی قدر کرتا ہوں مگر اس وقت ہمیں اپنے پیشے کی کی بہبودی اور سلامتی کے آگے کسی کے ذاتی نفع نقصان پر نظر نہ رکھنی چاہیئے اِس لئے میری رائے ہے اور میں اسی کو مناسب سمجھتا ہوں کہ اِسے بھی اس عورت کے پاس پہنچا دینا چاہیئے۔ مگر چونکہ یہ میری بیوی ہے اِسے میں اپنے ہاتھ سے مارنا نہیں چاہتا۔ محبوب! مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ تم اِس عورت کو لے جاؤ۔ یہاں سے بہت دُور لے جاؤ اور جس طرح مناسب سمجھو اسے ختم کردو۔ مگر بہت احتیاط سے جاؤ۔ مجھے اپنی کارروائی سے اطلاع دینا۔

اس کے بعد نواب صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔

نواب صاحب: نسیمہ! تم نے اپنی زندگی میں بدترین گناہ کیا جو ہمارے راز سے

آگاہ ہو گئیں۔ اگر تم اِس وقت یہ حماقت نہ کر بیٹھتیں تو میں تمہارے لئے خاصا اچھا شوہر ثابت ہوتا مگر خیر! ہاں اتنا اور سُن لو کہ یہ عورت بجائے نسیمہ کے قبر میں اُتاری جائے گی اور تمہارے والد صاحب کی موجودگی میں نہیں وہ پہچان نہیں سکیں گے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ عورت شکل و شباہت میں تم سے بہت زیادہ ملتی جُلتی ہے۔

اس کے بعد نواب صاحب نے محبوب کو اشارہ کیا وہ مجھے لے جانے لگا۔ میں اِس تمام عرصے میں بُت کی طرح خاموش تھی۔ سُن سب کچھ رہی تھی۔ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر میرا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو رہا تھا۔ اب جو محبوب نے مجھے ہاتھ لگایا تو گویا ہوش میں آگئی۔ دوڑ کر نواب صاحب کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور رو رو کر گڑگڑا کر کہنے لگی:۔

میں:۔ نواب صاحب! خدا کے لئے مجھے اپنے سے جُدا نہ کیجئے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اُسے بھول جاؤں گی خواب سمجھوں گی۔ کبھی ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاؤں گی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی خدارا معاف کیجئے۔

نواب صاحب:۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تم خود سوچو کہ میری زندگی کا سب سے تاریک پہلو تم پر واضح ہو جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ تمہارے دل میں میری وقعت رہے۔ تم مجھے شریف سمجھ سکتی ہو؟ تم مجھ سے محبت کر سکتی ہو؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر اس وقت تم اِن سب باتوں کا جواب اثبات میں

دے بھی دو تو میں تجربہ کار اور جہاندیدہ ہو کر تمہاری بات کا، ایک عورت کی بات کا یقین کر لوں گا، اور یہ میرے ساتھی مجھے اپنا سردار بنائے رہینگے جن کی جانیں تمہاری مٹھی میں ہوں گی؟ نہیں نسیمہ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

اب ہمارے سامنے فقط دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہم تمہاری جان لیں یا سب کے سب اسی دم تمہارے سامنے مر جائیں، تو ظاہر ہے کہ اتنی ساری جانوں کے مقابلے میں تمہاری اکیلی جان کچھ قیمت نہیں رکھتی

مختصر یہ ہے کہ محبوب مجھے روتی دھوتی کو کھینچ گھسیٹ کر لے گیا میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک گھوڑا گاڑی میں دھکیل دیا گیا۔ میں بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ ایک کمرے میں بند ہوں۔ دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں، منہ میں کپڑا ٹھسا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ محبوب نے میرے ہاتھ کھولے۔ منہ میں سے کپڑا نکالا اور کہنے لگا۔

محبوب:۔ آپ میرے سردار کی بیوی ہیں۔ قدرتی طور پر میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت ہونی چاہیئے۔ لیکن آپ سردار کی گفتگو سُن چکی ہیں جس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آپ کا وجود ہم سب لوگوں کے لئے کس قدر خطرناک ہے میں یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سردار کا حکم ہمارے لئے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھی...... مگر...... لیکن......

اتنا کہکر محبوب چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش تھی۔ بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ اتنے میں محبوب نے پھر کہا۔

محبوب:۔ آپ کا قصور بظاہر تو فقط اتنا ہے کہ آپ نے محض اتفاق سے سردار کی باتیں چھپ کر سُن لیں مگر اتنی سی بات سے آپ کو سردار کی اصل پوزیشن معلوم ہو گئی اور اب آپ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ کی بھی سمجھ میں آجائے گا کہ آپ کا وجود ہمارے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ پھر بھی میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ سردار کو آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے تھا فرمایئے۔

اس شخص کی گفتگو نہایت شائستہ اور شریفانہ تھی۔ مجھ سے آنکھیں چار بھی نہ کرتا تھا۔ نیچی نگاہیں کئے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے اصرار کرنے سے میں نے جواب دیا۔

میں:۔ تمہارے سردار میرے مالک ہیں۔ انہوں نے جیسا مناسب سمجھا حکم دیا تم اُس کی تعمیل کرو۔ میں حاضر ہوں۔

اُسے اس جواب کی توقع نہ تھی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا

محبوب:۔ میرا دل اس گناہ کی زندگی سے اُکتا گیا ہے۔ میں اس پیشے سے صدق دل سے توبہ کرنی چاہتا ہوں۔

میں:۔ اس سے اچھی کیا بات ہے۔ مگر کوشش کر کے اپنے سردار کو

بھی راہ راست پر لے آؤ عجب بات ہے۔

محبوب:۔ بجا فرمایا آپ نے۔ اگر وہ اس کے متعلق ایک لفظ بھی سن پائے تو کچا ہی چبا ڈالے۔ آپ اُس کی عادت سے واقف نہیں۔ نہایت ہی جابر ظالم، سنگدل، مکار اور دغا باز شخص ہے۔

میں:۔ تمہارا اس طرح کی گفتگو سے مطلب کیا ہے؟

محبوب:۔ آپ میرے لئے شمع ہدایت ہیں، مجسم نیکی ہیں۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میرے سر پر سے گناہوں کی گٹھڑی اتارنے والی اور میری ناؤ کو منجدھار میں سے نکالنے والی آپ ہی ہیں۔

میں اُس کی گفتگو سے کچھ کچھ سمجھ تو رہی تھی کہ اُس کا منشاء کیا ہے۔ پہلے پہل تو میرا خیال اُس کے متعلق یہ ہوا تھا کہ وہ نہایت شریف شخص ہے مگر اب میں اس کی مکاری کو سمجھ رہی تھی۔ اس وقت میری حالت بڑی نازک تھی۔ ڈاکو کے گھر میں تن تنہا، بے یار و مددگار۔ دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ جان کی تو فکر نہیں مگر عزت بچ جائے۔ یہ ڈاکو آدمی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ یہ جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہے۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ پھر بولا

محبوب:۔ اگر میں یہ کہوں کہ نہایت شریف خاندان کا ہوں۔ میرے خاندان کے اور لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ گورنمنٹ کے وفادار ملازم ہیں۔ اچھے عہدوں پر ہیں اور باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں تو غالباً آپ یقین نہیں کریں گی۔

اس لئے کہ حقیقت میں مَیں ننگِ خاندان آپ کی نظروں میں ایک ڈاکو ہوں اور ڈاکو زمین کی پیٹھ پر ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اب شریفانہ زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ روپے پیسے کی میرے پاس کمی نہیں۔ نہایت آرام واطمینان سے زندگی گذار سکتا ہوں۔ اگر آپ میری دستگیری کریں۔ مجھ پر نظرِ کرم ......

میں :۔ بس بس میں سمجھ گئی۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ اس خیالِ خام سے باز آ بے حیا بے غیرت مجھے اپنی بہن سمجھ۔

محبوب :۔ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ آپ جانتی ہیں سردار کا آپ کے لئے کیا حکم ہے؟

میں :۔ جانتی ہوں اور اُس کے لئے بالکل تیار ہوں۔ بسم اللہ کرو!

اس کے بعد اُس نے چھ دن تک مجھے طرح طرح کی تکلیفیں بھی دیں، منت خوشامد بھی کی، سمجھایا بھی مگر جب میں ٹس سے مس نہ ہوئی تو کل دوپہر کو مجھے اُس حوالات میں بند کر دیا جس وقت تم آئے ہو اُس سے گھنٹہ بھر پہلے قفل کھول کر آیا تھا۔ بہتیرا اسر پٹکا۔ جب میں راضی نہ ہوئی تو یہ کہکر چلا گیا کہ میں نے سردار کے حکم کے خلاف بہتیری کوشش کرلی کہ تمہاری جان بچالوں۔ تم نہیں مانتیں تو تم جانو۔ یہ گلاس تمہارے پاس رکھے جاتا ہوں۔ اس میں زہر ہے۔ اب صبح کو آؤں گا خوب اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو۔

میں اپنی نسیمہ کو لے کر اپنے گھر گیا۔ اُس کے گھر نہیں لے گیا اس ڈر سے کہ کہیں اُس کے والدین کو شادیٔ مرگ نہ ہو جائے۔ کلثوم تو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گئی۔ اور خوب روئی۔ میں نے سب کو اوّل سے آخر تک سارے واقعات سُنائے۔

دیکھئے کیا خدا کی قدرت ہے جب کوئی مصیبت آتی ہے تو ایک کے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی۔ بس نمبر ہی لگ جاتا ہے اور جب اللہ اپنی مہر کرتا ہے تو غیب سے سارے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ دیکھنے اور سننے سے تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ جب میں "آپ بیتی" اور "نسیمہ بیتی" کہہ چکا تو کلثوم نے کہا۔

کلثوم:۔ پاپ کی ناؤ بھر کر ہی ڈوبتی ہے۔ گناہوں کی سزا انسان کو دُنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ نواب ناصر نے جیسا کیا ویسا اُن کے آگے آیا۔

نسیمہ:۔ (جلدی سے) کیا ہوا، کیا ہوا؟

میں:۔ پکڑے گئے ہوں گے۔

کلثوم:۔ ہاں عذاب آخرت میں گرفتار ہوئے۔ خیر مرے ہوؤں کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نسیمہ:۔ (جلدی سے) اچھی کلثوم جلدی بتاؤ کیا ہوا؟

کلثوم:۔ آج چوتھا دن ہے کہ دلدار نگر سے خبر آئی کہ نواب ناصر شیر کے شکار کو گئے تھے شیر نے پھاڑ ڈالا۔ لوگ بڑی مشکل سے لاش گھر پر لائے کیونکہ انتڑیاں وغیرہ سب نکل گئی تھیں۔

نسیمہ نے یہ سُنتے ہی زور سے چیخ ماری اور رونے لگی۔ میرے بھی دل کو دھکا سا لگا حالانکہ میرے لیئے یہ خوشخبری بلکہ مژدۂ جانفزا تھا۔ بہت دیر تک نسیمہ کو سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد خیال آیا کہ چلو اسے ماں باپ سے ملا لاؤں۔ وہاں جاکر اسکی طبیعت کو سکون اور قرار آجائیگا۔ مگر پہلے میرا تنہا جانا مناسب تھا اس لیئے اکیلا ہی گیا اور نسیمہ کے والدین کو اپنی اور نسیمہ کی سرگزشت چپارگڈھ کے واقعہ سے لیکر آخر تک مفصل سُنائی۔ نسیمہ کے زندہ وسلامت آجانے کی خبر سُنتے ہی چچی جان چلاکر بولیں "ارے کیا میری بچی جیتی ہے۔ اور فوراً چلنے کے لیئے تیار ہوگئیں۔ چنانچہ چچی جان اور چچا صاحب کو لیکر میں اپنے گھر آیا۔ کس کس طرح سے چچی جان نے نسیمہ کو چمٹا چمٹا کر بھینچ بھینچ کر پیار کیا ہے اور بلائیں لی ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔ چچا صاحب نے بھی چمٹا لیا۔ سب چیخ چیخ کر رو رہے تھے اور سچ مچ ایک حشر سا بپا تھا۔ میں بھی رو رہا تھا۔ کلثوم بھی گریاں تھی۔ میری اماں جان اور ابا جان کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ غرض عجیب سماں تھا۔

عدت سے فارغ ہونے کے بعد نسیمہ، جسے میں اب تک اپنے دل وجان کی ملکہ سمجھتا تھا حقیقت میں میرے دل کی میری جان کی میری روح کی ملکہ بن گئی۔ اب ان واقعات کو دو برس گزر گئے مگر اب بھی ہم دونوں کو جب خیال آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ روح لرز جاتی ہے۔

نیلم کی انگوٹھی

لوگ کہتے ہیں کہ مکان کا، گھوڑے کا اور بیوی کا پہرہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مکان خریدنے کے بعد خریدنے والے کو اگر کسی قسم کی خوشی میسر آئی تو سمجھا جاتا ہے کہ مکان خریدنا بھاگوان ہوا اور جو کوئی مصیبت آپڑی تو سمجھے ہیں کہ یہ مکان منحوس ہے۔ یہی شگون گھوڑے کی نسبت بھی ہے۔ اسی طرح اگر شادی کے بعد سامانِ راحت میسّر آئے تو کہتے ہیں کہ دلہن بھاگوان ہی اور جو دولہا میاں یا اُن کے کسی قریبی رشتہ دار پر مصیبت آگئی تو گھر والے دلہن کو منحوس سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اکثر پتھروں میں تاثیر ہوتی ہے سعد و نحس کی یوں تو یہ جاہل لوگوں کی اوہام پرستی معلوم ہوتی ہے مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ جن لوگوں کو پیٹ بھر کر تعلیم کی دولت ملی ہے وہ بھی ایسے وہموں میں مبتلا ہیں۔ انگریزوں میں (میرا مطلب اُن لوگوں سے ہے جو انگریزی تمدن و معاشرت رکھ ہیں۔ چاہے امریکہ کے ہوں یا یورپ کے یا آسٹریلیا کے) تیرہ کا ہندسہ منحوس

مانا جاتا ہے اور نہ صرف مانا جاتا ہے بلکہ اکثر منحوس ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بدھ کو سفر نہیں کرتے۔ تیسری تاریخ کا چاند نہیں دیکھتے۔ عورت کی دائیں اور مرد کی بائیں آنکھ پھڑکے تو کہتے ہیں کچھ رنج پہنچے گا اور عورت کی بائیں اور مرد کی دائیں آنکھ پھڑکے تو کسی خوشی کے منتظر رہتے ہیں۔ مکھی آنکھ میں گھُسے یا لات مار جائے تو کہتے ہیں آنکھ سے آنسو نکلیں گے۔ اور جن لوگوں کو اس کا اعتقاد ہے اُن کے ساتھ ایسا ہوتا بھی ضرور ہے۔ اس کا تجربہ میرے گھر بھر کو ہے۔ دائیں بائیں آنکھ پھڑکنے اور تیسری تاریخ کا چاند دیکھنے کا تجربہ بھی میرے گھر بھر کو ہے اور خود مجھے ہے۔

سائنس والے جو بڑے بڑے قابل، لائق فائق اور مدبر مانے جاتے ہیں، خود طرح طرح کے وہموں میں مبتلا ہیں۔ میں نے پہلے تو اس کے متعلق سوچا اور اپنے دماغ کو خاصی تکلیف دی۔ مگر پھر یہ خیال کر کے چپکا ہو گیا کہ یہ سب کچھ قوت ارادی (Will Power) کے کرشمے ہیں۔ میرا تو اس قوت ارادی پر اس قدر مستحکم یقین ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ دعا بھی قبول ہوتی ہے تو قوتِ ارادی کی وجہ سے اور وہ جو پیغمبر جس بات کی دعا کرتے تھے اور وہ پوری ہو جاتی تھی تو اُس کی وجہ یہی ہو کہ اُن کی قوتِ ارادی اِس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جب چاہتے تھے اپنے خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کر ایک مرکز پر جمع کر لیتے تھے۔ اللہ پاک بھی اُن کے اِس خلوص (قوتِ ارادی) کو دیکھ کر ان کی دعا قبول کر لیتا تھا۔

خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ میرے کیا خیالات ہیں اور آپ کے نہ معلوم

کیا ہوں اس بحث میں نہ پڑیئے اور نیلم کی تاثیر کے متعلق دو واقعات سُن لیجئے ایک والد صاحب مرحوم و مغفور کا چشم دید ہے اور اُن کا بیان کردہ ہے جس کی صحت کا مجھے یقین ہے۔ دوسرا میرا اپنا چشم دید کیا خود اپنے اوپر گذرا ہوا ہے۔

(۱)

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ والد صاحب جونپور میں قانون گو تھے۔ شام کو کچہری کے اکثر سربرآوردہ ملازمین کا اجتماع یا تو والد صاحب کے ہاں ہوتا تھا یا تحصیلدار صاحب کے مکان پر۔ ایک دن باتوں باتوں میں کسی نے نائب تحصیلدار صاحب کی انگوٹھی دیکھکر جس میں نیلم کا نگینہ تھا، اُن سے کہا کہ یہ نیلم آپ کو راس آگیا ہے یہ تو شاذ و نادر ہی کسی کو راس آتا ہے۔

نائب تحصیلدار :- ہاں۔ مجھے تو یہ راس آگیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے ملازمت ہی اسی کی بدولت ملی ہے ورنہ جھک مارتا پھرا کرتا تھا۔

تحصیلدار :- کیوں فضول باتیں کرتے ہو۔ کہیں پتھر میں بھی تاثیر ہوتی ہے ؟

والد صاحب :- تحصیلدار صاحب۔ یہ تو نہ کہیئے۔ پتھروں میں تو ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ آدمی دیکھا کرے۔ میری انگوٹھی میں جو یہ فیروزہ ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ بہت ہی بھاگوان ہے۔

تحصیلدار :- اجی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اپنا اپنا اعتقاد ہے۔ بات جو ہونی ہوتی ہے ہو کر رہتی ہے۔ اگر کچھ راحت ملی تو سمجھ لیا اس پتھر کی تاثیر ہے اور جو کوئی

بپتا پڑ گئی تو کہنے لگے یہ راس نہیں آیا۔ سب لغو باتیں ہیں۔ پتھر میں کیا تاثیر دھری ہے۔

نائب تحصیلدار:۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ اللہ پاک نے کائنات کی ہر چیز کا دوسری چیز سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھا ہے۔ آپ نجوم کے قائل ہیں یا نہیں؟

تحصیلدار:۔ ہوں بھی اور نہیں بھی۔

نائب تحصیلدار:۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟

تحصیلدار:۔ مذہب تو نجوم پر یقین رکھنے کو منع کرتا ہے۔

نائب تحصیلدار:۔ مذہب کی بحث میں نہ پڑیئے۔ مَیں اس میں بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہوں۔ آپ کو قائل کر دوں گا مگر وقت لگے گا۔ اس وقت بحث یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہیے کہ نجوم کو آپ مانتے ہیں یا نہیں؟

تحصیلدار:۔ اکثر نجومی گذری ہوئی باتیں اور واقعات صحیح صحیح بتا تو دیتے ہیں۔

نائب تحصیلدار:۔ اور آئندہ کی؟

تحصیلدار:۔ غیب کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

نائب تحصیلدار:۔ اللہ تو جانتا ہی ہے مگر اُسی کے دیئے ہوئے علم سے بندہ بھی کچھ نہ کچھ جان لیتا ہے۔ کیا آپ کے مستقبل کے حالات کسی نے نہیں بتائے آپ کو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا؟

تحصیلدار:۔ ایک شخص نے تو یہاں تک بتا دیا تھا کہ آج سے بیسویں دن آپ کی بدلی پورب کی طرف ہو جائیگی اور فی الحقیقت ہوا بھی ایسا ہی۔ میں اُس زمانے میں کانپور کی تحصیل میں تھا اور بدلی ہوئی الہ آباد کی تحصیل میں۔ کچھ سان نہ گمان۔ ایکا ایکی حکم آگیا۔

نائب تحصیلدار:۔ پھر؟

تحصیلدار:۔ پھر کیا؟ اتفاق کی بات ہے۔

نائب تحصیلدار:۔ اِس "اتفاق" کے لفظ کو لغت میں سے نکال دینا چاہیئے۔

تحصیلدار:۔ اچھا اگر اتفاق نہ بھی ہو تو اِس کا نیلم کی تاثیر سے کیا تعلق؟

نائب تحصیلدار:۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علم نجوم ستاروں کے علم کا نام ہے ستاروں کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے اور بہت گہرا ہے۔ ستاروں کی گردش سے انسان کی حالت و کیفیت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ علم بہت ہی مشکل ہے اور ہے اتنا نازک کہ حساب میں ایک پل کی بھی غلطی ہو جائے تو نتیجہ کچھ کا کچھ نکلتا ہے۔

تحصیلدار:۔ مانا کہ علم نجوم ایک علم ہے اور بہت اچھا علم ہے، پھر ہے تو ہوا کرے یہاں اِس کے ذکر کا کیا موقعہ تھا؟

نائب تحصیلدار:۔ تھا کیسے نہیں۔ میں یہی تو کہنا چاہتا تھا کہ ستارے ہماری زمین اِتنی دور ہیں کہ اُن کا فاصلہ بتانے کے لئے ہماری ارب کھرب اور سنکھ

نیلم کی انگوٹھی

کی گنتی کافی نہیں۔ اُن کا فاصلہ یوں بتایا جارہا ہے کہ روشنی ایک سیکنڈ میں اتنے ہزار میل چلتی ہے۔ ہماری زمین سے فلاں ستارے کا فاصلہ روشنی کے اتنے برسوں کا ہے اور فلاں کا اتنے۔ بھلا خیال تو کیجیے کچھ ٹھکانہ ہے اس فاصلہ کا۔ مگر اُن کا اثر انسانی زندگی پر اِتنی دُور سے پڑتا ہے تو جس اللہ میں یہ قدرت ہے اُس نے اگر اُس پتھر میں کچھ تاثیر رکھ دی جو ہر وقت انسان کے ہاتھ میں رہے اور بدن کو مَس کرتا رہے، تو کیا یہ کچھ عقل سے بعید بات ہے؟

تحصیلدار:۔ خیر ہوگا۔ مجھے اِس کا اعتقاد نہیں۔

نائب تحصیلدار:۔ ہونا چاہیے۔

تحصیلدار:۔ (ذرا تیز ہو کر) یہ بھی کوئی زبردستی ہے۔ ارے بھئی اپنی اپنی سمجھ ہے اس میں حجت کا ہے کی ہے؟

والد صاحب نے جو دیکھا کہ تحصیلدار صاحب کے مزاج میں کچھ تیزی آگئی ہے تو بولے:۔

والد صاحب:۔ آج بحث نے کسی قدر ناگوار صورت اختیار کرلی۔ میں اتمامِ حجت کے طور پر ایک تجویز پیش کرتا ہوں بشرطیکہ تحصیلدار صاحب منظور کرلیں۔

تحصیلدار:۔ فرمائیے۔

والد صاحب:۔ آپ نائب تحصیلدار صاحب کی انگوٹھی پہن لیجیے۔ ایک ہفتے تک

اگر کوئی خاص بات نہ ہو تو آپ سچے اور اگر اس عرصے میں کوئی خاص بات یا واقعہ ہوگیا تو پھر آپ اسے "اتفاق" نہ کہئے گا اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ نیلم کی تاثیر ہے۔ خواہ وہ واقعہ آپ کے لئے مضرت رساں ہو یا نفع بخش۔

تحصیلدار منظور رہے۔

اِس گفتگو کے بعد تحصیلدار صاحب نے نائب تحصیلدار صاحب کی انگوٹھی پہن لی اور جلسہ برخاست ہوا۔ اِس کے تیسرے دن تحصیلدار صاحب کے پاس نینی تال سے کسی رشتہ دار کا تار آیا جو بیمار تھا۔ یہ چھٹی لیکر نینی تال گئے۔ صحت افزا مقامات پر انگریز اور میمیں بھی ہم نیٹو لوگوں کی طرح پیدل پھرا کرتی ہیں۔

ایک دن سہ پہر کو یہ بیچارے پریشان و مغموم سر جھکائے دوا کی شیشی لئے سڑک پر سے گذر رہے تھے کہ کسی میم کے شانے سے شانہ لگ گیا۔ بس جیسے میگزین میں آگ لگ گئی۔ وہ میم بپھر گئی۔ دو چار انگریز جمع ہو گئے اور تحصیلدار صاحب دو سپاہیوں کی حراست میں تھانے کی طرف روانہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ وہ لفٹنٹ گورنر صاحب کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ الزام یہ تھا کہ اِس کالے آدمی بلکہ جنگلی جانور نے اُن کو چھیڑا تھا اور جان کر شانے سے شانہ لگایا تھا

جونپور میں بذریعہ تار مختصر طور پر واقعہ کی اطلاع آئی۔ وہاں سے نائب تحصیلدار صاحب اور والد صاحب نینی تال گئے۔ جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حوالات میں پہنچ کر اُن سے وہ انگوٹھی لے کر نائب تحصیلدار صاحب نے اپنی انگلی میں پہنی۔

اِس کے بعد دوڑ دھوپ شروع کی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کو لیکر لفٹنٹ گورنر کی کوٹھی پر گئے۔ ان سے کہا کہ حضور وہ تو بڈھا آدمی ہے۔ دانت سارے مصنوعی ہیں۔ خضاب لگاتا ہے۔ پنشن میں صرف دو برس رہ گئے ہیں۔ اُس کے تو پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں موجود ہیں۔ وہ اِس قسم کی بیہودہ بات کیوں کرتا اور پھر حضور کی بیگم صاحبہ کے ساتھ جو ہم سب کی ماں ہیں۔ وہ تو بیچارہ اپنے عزیز کی بیماری کا تار پاکر چھٹی لے کر یہاں آیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاں سے دَوا لئے پریشان سر جھکائے جا رہا تھا۔ محض نادانستگی میں میم صاحبہ کے شانے سے شانہ لگ گیا۔ وہ تو سرکار کا خیر خواہ ہے۔ جون پور میں تحصیلدار رہے۔ وغیرہ وغیرہ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

تحصیلدار صاحب نے پھر تو وہاں کھڑے پانی بھی نہ پیا۔ فوراً ہی وہاں سے چل دیئے۔ راستے بھر نیلم ہی کا ذکر کرتے رہے۔ بلکہ نائب تحصیلدار صاحب سے بھی کئی دفعہ کہا کہ تم یہ انگوٹھی نہ پہنو اُتار دو۔ اُف خدا کی پناہ! یہ نیلم کس بلا کی چیز ہے۔ بھلا دیکھو تو سہی آناً فاناً میں کیا سے کیا ہو گیا اور جو لفٹنٹ گورنر صاحب نہ مانتے تو ساری عزت خاک ہی میں مِل گئی تھی۔

(۲)

دہلی میں چیف کمشنر صاحب کے دفتر میں میرے ایک دوست ہیں سید مہدی علی یہ بیچارے میٹرک پاس بھی نہیں۔ بہت دنوں تک ملازمت کی تلاش میں دربدر مارے

مارے پھرے۔ میں اکثر دیکھا کرتا تھا اور اُن کا حال پوچھ لیا کرتا تھا۔ پھر ایک دم سے وہ کہیں غائب ہو گئے۔ بہت دنوں کے بعد پھر ملے تو معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی دفتر میں ٹائپ کرنے پر ملازم ہو گئے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں نیلم کی انگوٹھی تھی۔ کہنے لگے۔ بھئی میرا تو اعتقاد ہے کہ یہ نیلم مجھے راس آگیا۔ جب سے یہ انگوٹھی پہنی ہے میری پریشانیاں فُرو ہو گئیں۔ میرے پُوچھنے پر اُنہوں نے بتایا کہ :۔

" میں یہاں دلّی میں جب لاٹ صاحب کے دفاتر آئے ہوئے تھے تو دس بجے سے وہیں چلا جاتا تھا۔ چار بجے تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ بیسیوں انگریز اِدھر سے اُدھر گذرتے ہیں ہر ایک کو سلام کر لیتا۔ پانچویں دن ایک انگریز کو جو سلام کیا تو وہ رُک گیا۔ اور کہنے لگا تم روز ہمیں سلام کرتے ہو کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا نوکری کی تلاش میں ہوں۔ اُس نے پوچھا ٹائپ جانتے ہو۔ میں نے کہدیا جی ہاں۔ حالانکہ ٹائپ برائے نام جانتا تھا۔ وہ انگریز مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا اور ہیڈ کلرک سے کہا کہ اس کا ٹائپ میں امتحان لے لو وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ یہ ہیڈ کلرک ایک مسلمان صاحب تھے جن سے میری یونہی سی شناسائی تھی۔ اِن کو چچا صاحب کے ہاں اکثر دیکھا تھا۔ اُنہوں نے صاحب سے جا کر میری تعریف کر دی۔ اُسی دن مجھے پچاس روپے ماہوار کی جگہ مل گئی چھ مہینے دفتر یہاں رہتا ہے چھ مہینے شملہ میں۔ اب میں شملہ سے آیا ہوں۔

اور روزانہ ٹائپ کرنے کی وجہ سے اب میں اِس کام میں خوب پکا ہوگیا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ نیلم مجھے راس آگیا۔"

کچھ عرصے کے بعد مہدی علی صاحب نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ یہاں چیف کمشنر صاحب کے دفتر میں کروالیا۔

مجھے یہ "داستان نیلم" سُن کر اشتیاق ہوا کہ میں بھی مقدر آزمائی کروں چنانچہ بڑی تلاش و جستجو کے بعد ایک دانۂ نیلم خریدا۔ چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ اب جو کچھ میں لکھتا ہوں حقیقت ہے۔ اِن واقعات کے جاننے والے میرے عزیز واقارب اور دفتر کے احباب موجود ہیں۔ میں اِسی محلّے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا مہینے کی دوسری تاریخ کو مکان دار صاحب حسب معمول تشریف لائے۔ جو لوگ گھر کا کرایہ دیتے ہیں اُنہیں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ محض اِس جُرم میں کہ وہ شریف ہیں، پہلی کو تنخواہ لاتے ہیں، دوسری کو کرایہ دے دیتے ہیں مکان دار صاحب ہمیں ایک قطعہ رسید دیتے تھے اور دوسری پر لکھوا لیتے تھے کہ "ایک قطعہ رسید وصول پایا۔" سچ پوچھئے تو ایسی حالت میں سرخط کی ضرورت نہ تھی کہ میری اُس رسید سے جو اُن کے پاس رہتی تھی میرے کرایہ دار ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔ مگر انہوں نے شروع میں تو سرخط لکھوایا ہی تھا۔ اِس مہینے کے ختم پر سال بھی ختم ہوگیا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ سرخط دوسرا لکھو۔ میں نے اُن سے ہر ہر طرح کہا۔ مگر اُن کی یہی ضد رہی کہ یا تو سرخط دوسرا لکھو یا مکان خالی کردو۔ مجھے بھی کچھ

ضد ہوگئی. سرخط ہمیں لکھکر دیا اِس کے بعد اُن کا نوٹس وکیل کی معرفت آیا. اور اٹھارہ دن میں ہم نے وہ مکان چھوڑ دیا. اِسی گلی میں مدتوں سے ہم لوگ رہتے تھے. ہمارے خاندان کے آٹھ نو گھر اسی محلے میں ہیں. یہیں ہم چھوٹے سے بڑے ہوئے. یہاں کے در و دیوار اور گلی سڑی گلیوں سے محبت ہوگئی ہے مگر اُس منحوس حیوان مکان دار کی خوشامد کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا. خیر اُسی گلی میں ہمارے ایک عزیز کا مکان تھا. وہ بال بچوں سمیت باہر جا رہے تھے. ہم تھوڑے دنوں کے لئے اُن کے گھر میں چلے گئے. لکھنے کو تو میں نے لکھدیا کہ ہم ایک گھر سے دوسرے میں چلے گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سخت تکلیف کا سامنا ہوا اِس لئے کہ والدہ صاحبہ، والد صاحب، بھائی بھاوج اور اپنی بیوی اِتنے آدمی تھے. اِن سب کو تکلیف ہوئی. اسباب مزدوروں سے بھی ڈھوایا اور خود بھی ڈھویا. اِس ڈھویا ڈھائی میں کتنی ہی چیزیں ٹوٹیں پھوٹیں. اِس مکان میں رہتے ہوئے ابھی چودہ پندرہ ہی دن ہوئے تھے کہ اُن رشتہ دار صاحب کا خط آیا کہ ہمارے بال بچے آ رہے ہیں مکان کی ضرورت ہے. بڑی مشکل ہوئی یاالٰہی اب کیا کریں. مجبوراً محلّے سے باہر مکان ڈھونڈتے پھرے. جو ایک آدھ پکّا مکان ملا بھی تو اُس میں گنجائش کافی نہ تھی. جن میں گنجائش تھی اُن کا فرش کچّا نہ تھا جگہ جگہ گھونسوں نے غار ڈال رکھے تھے. مختصر یہ ہے کہ ایک اور رشتہ دار کے مکان میں گئے. وہاں سے بھی چند روز کے بعد بھاگنا پڑا اور ہار جھک مار کر

اُن ہی مکان دار کی خوشامد کرنی پڑی ۔اُس پہلے مکان میں ایک کُنجڑے صاحب قبلہ تشریف لے آئے تھے ۔اُنہیں اُٹھایا اور پھر اُسی میں گئے ۔ یہ دو مہینے اور سات دن بڑی پریشانی اور کوفت میں گذرے ۔ہاں یہ اور سُن لیجئے کہ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی ۔اپنی بیوی کو اس تانے بانے سے بچانے کے لئے میں خود اُن کی بہن کے پاس بلند شہر پہنچا آیا تھا جہاں اُن کے میاں محکمۂ نمک میں انسپکٹر تھے ۔وہاں جو سالی صاحبہ سے کہا کہ سترہ روپے کا نیلم لیا تھا ، ایسے چاؤ سے انگوٹھی بنوائی ۔اب جی چاہتا ہے کنوئیں میں پھینک دوں تو انہوں نے کہا کہ واہ بھئی پھینکتے کیوں ہو ۔لاؤ مجھے دو ۔میں ایسا وہم نہیں پالتی ۔چنانچہ میں اُنہیں انگوٹھی دے کر یہاں دہلی چلا آیا ۔یہاں آنے کے دوسرے دن مجھے کچھ خیال آیا اور میں مکان دار کے پاس جاکر صلح وصفائی کر آیا ۔بارہویں دن ہماری بیوی صاحبہ کا بڑا لمبا چوڑا خط اور وہ انگوٹھی ایک ملازم آن کر دے گیا ۔لکھا تھا :

" بھائی صاحب (آپا کے میاں) کئی دن سے چُپ چُپ رہا کرتے تھے ۔ پرسوں اُنہوں نے بتایا کہ اُنہیں خبر ملی ہے کہ اُن کی سانبھر کی بدلی ہوگئی ۔حکم جاری ہوگیا ہے ایک آدھ دن میں آنے والا ہے ۔میں نے اُسی وقت آپا سے کہا کہ یہ اس نیلم کا اثر ہے ۔خدا کے لئے اِس انگوٹھی کو اُتار دو ۔اُنہوں نے اُسی وقت انگوٹھی اُتار کر مجھے دے دی ۔بھائی صاحب رات کی گاڑی سے آگرہ گئے ۔وہاں صدر دفتر میں جاکر کوشش کی ۔بارے شکر ہے کہ اُن کی بدلی کا حکم منسوخ ہوگیا دوسرے آدمی کے نام حکم گیا ۔

وہ اپنی آنکھ سے دیکھ آئے۔ آج صبح کی گاڑی سے آئے ہیں۔ یہ انگوٹھی آدمی کے ہاتھ بھیجتی ہوں۔ آپ خدا کے لئے اپنے پاس نہ رکھئے۔ کہیں دو چار روپے کو بھی بکے تو بیچ دیجئے ورنہ کنوئیں میں ڈال دیجئے۔"

میں تو اس کا تجربہ کرچکا تھا بھلا اب کاہے کو پہنتا۔ انگوٹھی صندوق میں رکھ دی مگر ڈرتا ہی رہا کہ کہیں صندوق کے اندر ہی سے یہ ظالم اپنی بلا کی کرنیں نہ پھیلائے انگوٹھی صندوق میں رکھ کر دفتر چلا گیا۔ دماغ میں نیلم کی کارگذاریاں بسی ہوئی تھیں۔ وہاں ہیڈ کلرک صاحب سے بیٹھا ذکر کر رہا تھا۔ اور بھی دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ پاس ہی عبداللہ چپراسی کھڑا تھا۔ جب بیان کرچکا تو میں نے کہا کہ انگوٹھی صندوق میں رکھ تو آیا ہوں مگر ڈر رہا ہوں، کہ کہیں گھر جاتے تک کوئی اُفتاد نہ پڑ جائے۔ سترہ روپے کی انگوٹھی ہے۔ اگر کوئی صاحب لینی چاہیں تو پانچ روپے میں دیدونگا۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا تو میں نے کہا بس تو میں جاکر کنوئیں میں پھینک آؤں گا۔ یہ سنتے ہی عبداللہ بولا

عبداللہ:۔ میاں آپ پھینکتے کیوں ہیں مجھے دیدیجئے۔ میں پہن لونگا۔

میں:۔ بیوقوف نقصان اُٹھائے گا۔ کیوں لالچ کرتا ہے۔

عبداللہ:۔ نہیں میاں مجھے دے ہی دیجئے۔ آپ کے بچے جیتے رہیں۔

میں:۔ تونے ساری باتیں سن لی ہیں یا نہیں۔ یہ بڑی بُری چیز ہے۔ جہاں جائیگی تباہی لائیگی۔

غرض میں نے بہتیر اسمجھایا وہ مانا ہی نہیں سر ہی ہوگیا۔ ہیڈ کلرک صاحب نے بھی کہا کہ دے کیوں نہیں دیتے۔ جب وہ سر ہوکر مانگ رہا ہے تو دیدو۔ کیا خبر ہے کہ اس غریب کو راس ہی آجائے۔ سترہ روپے کی انگوٹھی پھینکتے ہوئے میرا دل بھی دُکھتا تھا۔ دوسرے دن میں نے انگوٹھی

لے جا کر ہیڈ کلرک صاحب کے سامنے عبداللہ کو دیدی اور اُس وقت بھی اپنی سی کوشش کر لی کہ یہ باز آجائے مگر اس نے ایک نہ مانی۔ کوئی آٹھویں دن عبداللہ کی بخار کی عرضی آئی۔ خیر کوئی بات نہیں دوسرے دن وہ دفتر آگیا۔ چوتھے دن پھر بیماری کی درخواست آئی۔ تین دن کے بعد آیا تو میں نے دیکھا کہ بہت کمزور ہے میں نے ہیڈ کلرک صاحب سے کہا کہ حضرت خدا کے واسطے اس کی انگلی میں سے یہ انگوٹھی اتروا دیجئے نہیں تو یہ غریب جان سے جائیگا۔ یہ سارا فساد اسی نیلم کا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ بھئی عبداللہ یہ انگوٹھی اُتار دے تجھے راس نہیں آئی۔ مگر وہ یہی کہتا رہا۔ واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہے۔ بخاروں کے دن ہو ہی رہے ہیں کسے نہیں آرہا۔ اللہ نے مجھے مفت میں ایسی قیمتی انگوٹھی دلوائی میں کیسے اُتار دوں۔ خیر گئی گذری بات ہوئی۔ تھوڑے دن گذرے تھے کہ اُس کی پندرہ دن کی درخواست آگئی۔ پھر پندرہ دن کی اور آئی۔ معلوم ہوا کہ اُسے دق ہوگئی ہے۔ میں نے ہیڈ کلرک صاحب سے کہا کہ وہ بیوقوف جان دیگا۔ اُس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں آپ بڑے صاحب کے اردلی کو بلوائیے اور اُس سے تاکید کر کے کہئے کہ عبداللہ کے گھر جا کر وہ انگوٹھی اُس کی انگلی میں سے زبردستی اُتار لائے فیض محمد (اردلی) عبداللہ کے گھر گیا دوسرے دن آن کر کہنے لگا کہ میں نے اُسے ہر ہر طرح سے سمجھایا وہ مانا ہی نہیں۔ جب میں زبردستی انگوٹھی اتارنے لگا تو مجھے گالیاں دینے لگا۔ مختصر یہ ہے کہ ایک دن سُنا کہ عبداللہ کا انتقال ہوگیا۔ دق کے مریض برسوں جھولتے ہیں مگر بعضوں کو ایسی بھی ہوتی ہے کہ دو چار ہی مہینے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی حال عبداللہ مرحوم کا بھی ہوا۔ اب معلوم نہیں وہ انگوٹھی کہاں ہے کس کے پاس ہے اور کیا کر رہی ہے۔

یہ واقعات میں نے بے کم و کاست لکھے ہیں۔ ان کے دیکھنے، سُننے اور جاننے والے بیسیوں یہاں موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا علم محدود ہے عقل ہمارے پاس بہت ہی ذرا سی ہے پھر بھلا سمجھیں تو کیا سمجھیں اور ایک یہ کیا ہزاروں لاکھوں باتیں ایسی ہیں کہ ان میں ہم دن رات عقل لڑاتے ہیں ان کے سمجھنے کیلئے سر کھپاتے ہیں مگر ہار جھک مار کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "خدا کی باتیں خدا ہی جانے"۔

زندہ در گور

پنڈت دین دیال الہ آباد میں محکمۂ تعمیرات میں ہیڈ کلرک تھے پنشن لینے کے بعد انہوں نے اپنے وطن جھوسی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ اُن کی ملازمت کے زمانے میں بہت سے قصے اُن کی نسبت مشہور تھے کہ مسمریزم یا کسی اور علم کے ذریعے وہ لوگوں کے امراض کھو دیا کرتے ہیں۔ دُور دُور کے لوگ اُن کے پاس تڑپتے چیختے آتے ہیں اور اچھے بھلے چنگے ہو کر چلے جاتے ہیں۔ میں بھی الہ آباد میں محکمۂ ریلوے میں کلرک تھا۔ مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ پنڈت جی سے ملوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ وہ کس طرح لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔

ایک دن میرے دفتر کے ایک دوست مجھے پنڈت جی کے پاس لے گئے پنڈت جی اپنے مکان کے آگے چبوترے پر ایک ٹوٹے سے مونڈھے پر بیٹھے تھے میں نے تو انہیں دیکھکر یہ سمجھا کہ کوئی مہاتما جی براجمان ہیں، وہ کسی صورت اور کسی طور سے ہیڈ کلرک جچتے ہی نہ تھے۔ بیچارے نہایت ہی محبت اور اخلاق سے ملے باتیں ایسے دھیمے اور میٹھے میٹھے لہجے میں کرتے تھے کہ جی چاہتا تھا گھنٹوں سُنتے ہی جاؤ۔ مگر میں تو اور ہی خیال سے گیا تھا۔ اُن کے متعلق ایسی خلافِ عقل باتیں

سُنی تھیں کہ یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا اور ہے بھی یہی کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" جب تک کوئی آنکھوں سے دیکھ نہ لے کیونکر یقین کر لے۔ اتفاق دیکھئے کہ ہمارے جانے کے کوئی بیس ہی منٹ کے بعد ایک صاحب آئے جنٹلمین کی وضع کے اور اس حالت سے کہ دو آدمی اُن کی بغلوں میں ہاتھ دیئے ہوئے تھے اور اُن کی ایک چیخ زمین کو جاتی تھی تو ایک آسمان کو۔ گویا "ہائے پنڈت جی مرا" کا سبق یاد کر رہے تھے۔ پنڈت جی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور "کیا ہے بھیّا کیا ہے بھیّا" کہتے ہوئے اُسے مونڈھے پر لا کر بٹھایا۔ مگر اُسے کہاں قرار تھا۔ ایک پلٹی لے کر وہ گرا اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اب یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ پنڈت جی نے زمین ہی پر اُکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ کر اُس کا منہ زبردستی اپنی طرف کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا۔ اب سُنیئے کہ پنڈت جی تو اُس مریض کی آنکھوں کی طرف گھور رہے ہیں اور ہم پنڈت جی کی آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں۔ پنڈت جی کی آنکھوں کے اوپر کے پپوٹے آہستہ آہستہ اُوپر کی طرف کھنچ رہے ہیں یہاں تک کہ اُن کی آنکھیں خوفناک طریقے سے پھٹ گئیں۔ سیاہی تو سیاہی سفیدی بھی چمکنے لگی۔ لال لال ڈورے پڑ گئے۔ مریض کو دیکھا تو اب ساکت تھا۔ آنکھوں سی آنکھیں ملی ہوئی تھیں۔ اب پنڈت جی نے اسی طرح مریض کی آنکھوں کو گھورتے ہوئے اپنے ہاتھ عجیب عجیب طرح سے چلانے شروع کئے۔ دو منٹ کے بعد وہ شخص چپ چاپ لیٹ گیا۔ گویا سو گیا۔ اب پنڈت جی ساتھ والوں کی طرف

متوجہ ہوئے اور پوچھا اِس کا کیا حال ہے۔ جواب مِلا کہ کل رات سے پیٹ میں سخت درد ہے۔ پے در پے کئی حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوائیں دیں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

پنڈت جی نے کہا جاؤ جلدی سے ایک بڑی بوتل لے آؤ۔ دیکھو ڈاٹ ذرا مضبوطی سے لگوا کر لانا۔ تھوڑی دیر میں بوتل آگئی۔ وہیں سامنے والے نل پر سے بوتل میں پانی بھروالیا۔ اب آپ کو اختیار ہے یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ پنڈت جی نے ڈاٹ کھول کر تھوڑا سا پانی بوتل کا پھینکا۔ پھر اپنی انگشتِ شہادت بوتل میں ڈالی اور پیلے کی طرح ڈراؤنی آنکھیں کر کے پانی کو گھورا۔ پانی میں ایک جوش اٹھا جیسے سوڈا واٹر کی بوتل کھولنے سے اُٹھتا ہے۔ بس پھر انہوں نے ڈاٹ لگا دی۔ کوئی ایک منٹ تک بوتل ہاتھ میں لئے رہے۔ اِس کے بعد "رامو" کہکر آواز دی۔ گھر میں سے ملازم آیا۔ اُس سے کہا گلاس لے آ۔ گلاس آیا۔ پنڈت جی نے دو گھونٹ پانی بوتل میں سے نکالا۔ اب ایک ہاتھ میں گلاس ہے۔ دوسرا ہاتھ خالی کر کے مریض کے ماتھے، کنپٹیوں اور آنکھوں پہ پھیرا۔ مریض نے آنکھیں کھولتے ہی زور سے "ہائے رے مرا" کہا۔ پنڈت جی نے کہا۔ چپ رہو جی۔ اب کیوں ہائے وائے کرتے ہو؟ اب وہ شخص اُٹھ بیٹھا اور لگا ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے۔ پنڈت جی نے گلاس دیا کہ "لو پی لو"۔ وہ پی گیا۔ پنڈت جی نے کہا اب کیسا حال ہے؟۔ پاؤں پر سر رکھ دیا اور بولا مہاراج دھن ہے۔ آپ نے میرا روگ

کھو دیا۔ خیر وہ لوگ تو چلے گئے۔ میں نے دو چار سوال اِس کے متعلق پنڈت جی سے کئے۔ مگر وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ پرماتما کی اِچھا ہے۔ میں تو گنہگار آدمی ہوں۔ اِس کے بعد میں گھر چلا آیا۔ مگر سارے راستے سوچتا آیا کہ کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر دوا کے اِس طرح آدمی ایسے موذی مرض سے نجات پا جائے اور اِتنے جلدی؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہو کیونکر سکتا ہے۔ بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد دل نے یہی کہا کہ میاں یہ دُنیا دغا اور فریب کی بنی ہوئی ہے۔ کیا خبر تم ہی پر ڈورے ڈالے جا رہے ہوں۔ یہ سب لوگ سکھائے پڑھائے تھے پروگرام کے مطابق اپنا اپنا پارٹ کر گئے۔ تم بچتے رہنا۔ یہ سر مونڈنے کے سامان معلوم ہوتے ہیں۔

اِن باتوں کو مدتیں گذر گئیں۔ میرا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا۔ وہاں سے بنارس کی بدلی ہوئی۔ اب دو برس سے میرٹھ میں ہوں۔ میں نے اُس نو برس پہلے کے واقعے کو بھلا بھی دیا تھا۔ اب چھٹی لیکر الہ آباد آیا تھا کہ بھائی! ماد ج سے بھی مل لوں گا اور بال بچّوں کی سیر بھی ہو جائیگی۔ بہت دِنوں سے سر ہو رہے تھے کہ الہ آباد کی سیر کروا ئیے دیکھیں گے گنگا جمنا کیونکر ملتی ہیں۔ ریل والوں کو یہ بڑا آرام ہے کہ مفت میں جہاں چاہو چلے جاؤ۔ چنانچہ پاس منگوا کر بال بچّوں سمیت الہ آباد آ گیا۔ یہاں پہنچ کر خیال ہوا کہ لاؤ پنڈت دین دیال کا بھی ذرا پتہ لگاؤ۔ جیتے ہیں یا مر گئے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے پنشن لے کر جھوسی میں بود و باش اختیار کر لی ہے۔ جھوسی الہ آباد سے

ہے ہی کتنی دُور۔ چنانچہ میں نے وہاں پہنچکر بہت جلد اُن کے مکان کا پتہ لگالیا پنڈت جی میں بظاہر کچھ فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔ ہاں بال ذرا زیادہ سفید ہو گئے تھے، بڑی محبت سے ملے۔ پہچان گئے۔ خیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک جنٹلمین کوٹ پتلون پہنے ہیٹ لگائے دُور سے آتے دکھائی دیئے۔ اُن کے پیچھے غالباً اُن کا نوکر تھا جو ہاتھ میں ٹوکری سی لئے ہوئے تھا۔ میں سمجھا کوئی راہگیر ہیں جا رہے ہوں گے کہیں۔ مگر وہ صاحب تو بڑی بڑی ڈگیں بھرتے ہوئے ہماری ہی طرف آئے اور آتے ہی پوچھا۔

"پنڈت دین دیال صاحب کا مکان آپ بتا سکتے ہیں؟"

میں نے پنڈت جی کی طرف اشارہ کر کے کہا

"یہی ہیں پنڈت جی۔"

ارے میاں میرا اتنا کہنا ستم ہو گیا۔ اُس پر تو گویا دورہ سا پڑ گیا۔ یعنی بالکل ہیٹ دسوٹ آپ دھڑ سے پنڈت جی کے پاؤں پر گر پڑے اور زار و قطار رونے لگے۔ میں نے کہا یہ کیا مصیبت آئی۔ یہ کیسا مریض ہے جسے رونے کا مرض ہے۔

پنڈت جی گھبرا کر بولے۔ "ہیں ہیں یہ کیا کرتے ہو، یہ کیا کرتے ہو اٹھو اٹھو"

آخر پنڈت جی نے اُنہیں زبردستی کرسی پر بٹھایا۔ پھر پوچھا۔

"آپ کون صاحب ہیں، کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

شخص۔ میرا نام فیض الحسن ہے۔ کانپور سے آ رہا ہوں

پنڈت جی:۔ کیسے تشریف لائے؟

فیض الحسن:۔ پنڈت جی مہاراج! آپ کے اس سوال نے میرے دل میں قیامت برپا کردی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا، کیسے آیا؟ یوں سمجھیئے کہ اب انسان ہوں، انسانوں کی بستی میں ہوں، عدم آباد سے آیا، قبر میں سے آیا، آپ کی مہربانی سے آیا، اپنے پاؤں سے چل کر آیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ چلو آج جوسی کی یہ سیر خاصی رہے گی۔ اس دیوانے کی باتوں میں بڑا مزہ آئے گا۔ یہ کوئی نئی روشنی کا کوٹ پتلون والا دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔

پنڈت جی کچھ دیر تک تو چپ چاپ اُسے دیکھتے رہے پھر ملائمت سے بولے:۔

پنڈت جی:۔ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟

فیض الحسن:۔ آپ کی مہربانی سے اب بالکل اچھا ہوں۔

پنڈت جی:۔ مہربانی کر کے اپنا حال مفصل سنائیے۔ میں بالکل نہیں سمجھا کہ آپ کون صاحب ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ ذرا صاف صاف بیان کیجئے۔

فیض الحسن:۔ پرسوں آپ کے پاس کانپور سے کوئی تار آیا تھا؟

پنڈت جی:۔ ہاں ہاں آیا تھا۔ پھر؟

فیض الحسن:۔ میرے ہی سانپ نے کاٹا تھا۔

پنڈت جی "ارے" کہہ کر اُٹھے اور فیض الحسن کو گلے لگا لیا۔ پھر کہا

بیٹھو بیٹھو۔ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

فیض الحسن:۔ پنڈت جی آپ نے مجھے موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ میرے عزیز و اقارب تو مجھے دفن بھی کر چکے تھے۔

یہ کہکر فیض الحسن نے زور سے پھریری لی۔ پھر آپ رومال منہ پر رکھکر پھوٹ پھوٹ کا رونے لگے۔ پنڈت جی نے پانی منگوا کر پلایا۔ تھوڑی دیر سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر پنڈت جی نے کہا:۔

"اچھا میاں فیض الحسن اب اپنا حال مفصل بیان کرو۔"

فیض الحسن:۔ میں کانپور کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد بدر الحسن صاحب کا نام آپ نے سُنا ہوگا۔ چمڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اِس وقت علاوہ چمڑے کے کارخانے کے میرے والد صاحب کی دس گیارہ لاکھ کی جائداد کانپور میں موجود ہے۔ ہم دو بھائی ہیں۔ ابو الحسن مجھسے چار برس چھوٹے ہیں۔ والد صاحب قبلہ نے تین برس سے کاروبار کی نگرانی ہم دونوں بھائیوں کے سپرد کر رکھی ہے اِس طرح سے کہ چمڑے کے تمام کاروبار کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہے اور جائداد کا کرایہ، مرمت، ٹیکس، آباد کرنا، خالی کرانا وغیرہ یہ سب کام ابو الحسن کے ذمہ ہیں۔ ابو الحسن کا صرف ایک لڑکا ہے جو اِس سال بی۔ اے کا امتحان دے گا۔ میرے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ خیر یہ تو کچھ فضول سی باتیں ہیں میں پرسوں کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارا گھر بہت بڑا ہے۔ دونوں بھائی مع

بال بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ والد صاحب قبلہ بھی اُسی میں رہتے ہیں۔ ہمارے گھر کے آگے بہت سی زمین بیکار پڑی تھی۔ میں نے اُس میں کچھ امرود، انار نارنگی، لیموں وغیرہ کے درخت لگوا کر ایک چھوٹا سا باغیچہ بنا لیا ہے۔ موتیا چنبیلی، گلاب کے پودے بہت سارے لگوا دیئے ہیں۔ بجری کی چھوٹی چھوٹی روشیں بنوالی ہیں۔ غرض وہاں ایک خوشنما باغیچہ بن گیا ہے۔ اکثر صبح و شام میں وہاں جا بیٹھتا ہوں اور دل بہلا لیتا ہوں۔ پرسوں سہ پہر کو میں ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی میری تین سال کی بچی کھڑی پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی کہ ایک دم سے میرے بڑے لڑکے منیر حسن کے چیخنے کی آواز آئی۔

"اباجان سانپ"۔ میں دوڑ کر گیا تو دیکھا کہ منڈیر پر منیر کھڑا ہے اور نیچے کالا سانپ پھن اٹھائے پھنکاریں مار رہا ہے۔ میرے آواز دینے پر میرے چھوٹے بھائی ابوالحسن بھی آ گئے اور دونوں مالی بھی لاٹھیاں لئے آن پہنچے اب سب کے سب بے اوسانی میں پھٹاپھٹ کر رہے ہیں مگر سانپ کے ایک نہیں لگتی۔ اتنے میں سانپ بھاگا۔ میں لکڑی لئے بے تحاشا اُس کے پیچھے دوڑا اور ایک دو ہتی بھرپور رسید کی۔ لکڑی پڑتے ہی سانپ بلبلا کر مڑا۔ میں قریب ہی تھا۔ پلٹتے ہی پاؤں پر منہ مارا۔ سلیپر تو پہنے ہی ہوئے تھا۔ پاؤں پر پورا منہ پڑا۔ اتنی دیر میں پے در پے لکڑیاں جو پڑیں تو سانپ کا کچلا ہو گیا میں نے چیخ کر منیر سے کہا۔ "بیٹا میرے سانپ نے کاٹ لیا"۔ سب کے سب

میری طرف متوجہ ہوگئے۔ میرا یہ حال کہ ایک ایک پاؤں مَن مَن بھر کا ہوگیا رگوں میں بجائے خون کے آگ بھری ہوئی معلوم ہونے لگی۔ تمام بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے بجلی کی کرنٹ تمام جسم میں دوڑ رہی ہے مگر میرا دماغ بالکل ٹھیک تھا اور نہ صرف دماغ بلکہ دیکھنے اور سُننے کی قوتیں بھی بحال تھیں۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ بدن کے اعضاء میرے قابو میں نہیں۔ میں لاکھ کوشش کرتا تھا کہ ہاتھ ہلاؤں، پاؤں چلاؤں، بولوں، پکاروں مگر مجبور تھا۔ سب کی آوازیں سُن رہا تھا، باتیں سمجھ رہا تھا مگر خود نہ بول سکتا تھا۔ بدن کے ایک ایک عضو نے میرا کہنا ماننے سے صاف انکار کردیا تھا۔ میری آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں۔ سب کو دیکھ رہا تھا مگر پلک تک نہ جھپکا سکتا تھا میری ٹانگ پر ران کے نیچے تین جگہ بند باندھے گئے۔ ڈاکٹر آیا میرا منہ چیر کر دوا پلائی، میرے ہاتھ پاؤں سُونتے، میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے چلانے پھرانے کی کوشش کی۔ میری بیوی بَین کرتی ہوئی بے پردہ نکل آئی۔ بچے بھی رونے چیخنے لگے، میرا بڑا لڑکا منیر جس کی عمر اکیس برس کی ہے، اِدھر اُدھر بولایا بولایا پھر رہا تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سُن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا مگر بے بس تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک اور ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ نبض دیکھی، سینے پر آلہ رکھا۔ پھر بڑے زور سے "اوہو" کہا اور جلدی جلدی انجکشن کا سامان تیار کر کے اُلٹے بازو میں سوئی گھونپ

دی۔ اِدھر نوکروں کی بھاگ دوڑ، لوگوں کی چیخ پکار، بیوی بچّوں کے رونے دھونے کی آوازیں۔ غرض سب مل ملا کر ایک حشر سا بپا تھا۔ تھوڑی دیر میں اُس حشر میں بھی ایک اور قیامت برپا ہوگئی۔ یعنی دونوں ڈاکٹروں نے نبض دیکھکر، آلات لگا کر، گردنیں نیچی کر کے، ٹھنڈے سانس بھر کر اپنے سر ہلا دیئے۔ یعنی یہ کہ ہم مر گئے۔ ختم ہو گئے۔

پنڈت جی! میں اِس وقت کتاب سی لیکر آپ کے سامنے پڑھ رہا ہوں اور آپ سُن رہے ہیں مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ آپ کو میری تکالیف کا، میرے تشنج کا، میری بےکسی اور بےبسی کا صحیح اندازہ ہرگز نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ آپ بھی کبھی ایسے ہی حالات سے دوچار نہ ہوئے ہوں۔ ذرا خیال تو کیجئے میں جیتا ہوں، سب کچھ دیکھ رہا ہوں، سُن رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں، مگر نبضیں ساقط ہی ہوں گی، قلب کی حرکت بند ہی ہوگی جو ایک چھوڑ دو دو تجربےکار ڈاکٹروں نے موت کا فتویٰ دے دیا۔ بیوی کا پچھاڑ کھا کر میری زندہ لاش پر گرنا بچّوں کا لپٹ لپٹ کر رونا، کبھی منہ پر منہ رکھنا، کبھی میرے تلووں سے اپنی آنکھوں کو ملنا۔ "ہائے ابا ہمیں یتیم کر گئے۔" "ہائے میرے سرتاج مجھے کس پر چھوڑا!" میں سچ کہتا ہوں دوست تو دوست دشمن بھی سُنتے تو رو پڑتے۔ مگر میں رو بھی نہ سکتا تھا۔ اِتنے میں بھائی کی آواز آئی کہ "بھابی صبر کرو۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ یوں بیٹھے بٹھائے بھلے چنگے بھائی جنت الفردوس کو سدھاریں۔

ہائے بھائی میری کمر توڑ گئے"۔ پھر اُنھوں نے بھی پچھاڑیں کھانی شروع کیں اب میرے کانوں میں آواز آئی کہ بڑے سرکار آرہے ہیں۔ اباجان تشریف لائے اور اس طور سے کہ ڈاڑھی اور سر کے بال ایک ہاتھ سے نوچتے آرہے تھے اور ایک ہاتھ سے لکڑی کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ خدا کسی ستر برس کے بوڑھے کو جوان بیٹے کی موت نہ دکھائے۔ میرا بے حس کلیجہ اُس وقت اُن کی حالت دیکھکر اور اُن کے بَین سُن سُن کر کٹا جاتا تھا۔ ہاں ایک جُملہ معترضہ اور سُن لیجئے۔ وہ یہ کہ والد صاحب قبلہ نے والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ محض اولاد کی تکلیف کے خیال سے۔ ورنہ اُن جیسے لکھپتی شخص کو تجرد کی زندگی گذارنے سے کیا کام تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ اُنہیں اپنے دونوں بیٹوں سے کیسی محبت تھی۔ ہم دونوں بھائی ناسمجھ ہی تھے کہ ماں نے انتقال کیا۔ اِس ضعیف العمر شخص نے جو اِس وقت میری لاش سے لپٹا ہوا رو رہا تھا' مجھے اور میرے بھائی کو ماں کی طرح پالا۔ اُف اب اور لینے کے دینے پڑ گئے۔ یعنی والد صاحب کی حالت خراب ہونے لگی لوگ اُنہیں اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ میرے لئے اور بھی سوہان روح ہوا۔

پنڈت جی کہاں تک بیان کروں۔ یہ رونے دھونے کا قصہ تو اس قدر طویل ہے کہ آپ سُنتے سُنتے ابھی اُکتا گئے ہوں گے اور نہیں تو تھوڑی دیر میں

اُکتا جائیں گے۔ اس لئے اسے یہیں چھوڑتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ نہانے والے صاحب تشریف نہ لے آئے۔ مجھے تختے پر لٹایا گیا۔ ایسے حالات میں یہ کہنا مناسب تو نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے ہنسی بھی آئی (گو ہنس نہ سکا) اور شرم بھی کہ قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ پیدا ہوئے دائی نے نہلایا تو کچھ روئے چیخے چلاّئے ہاتھ پاؤں چلائے۔ مگر اب دیکھئے کہ پانچ بچوں کے باپ، چالیس برس کی عمر کے جوان نہیں تو ادھیڑ ہی سہی۔ ایک تختے پر ننگے چم پڑے ہیں اور مزا یہ کہ چُوں بھی نہیں کر سکتے۔ مُردہ بدست زندہ تو سُنتے آئے تھے مگر زندہ بدست زندہ اب دیکھا۔ غرض مجھے نہلا دُھلا کر کفن پہنایا گیا۔ اُس وقت کمرے میں صرف تین شخص تھے۔ یعنی منیر حسن میرا لڑکا، اور میرا چھوٹا بھائی ابوالحسن اور اُس کا لڑکا نورالحسن۔ میں اپنے اِس طرح زبردستی دفن کئے جانے سے سہما جا رہا تھا اور بے انتہا پریشان اور سراسیمہ تھا ہی کہ اِن تینوں کی گفتگو سُن کر حیران و ششدر رہ گیا۔

منیر:۔ اچھّی چچا جان! میرے ابّا کو ابھی دفن نہ کیجئے یہ جی جائیں گے۔

چچا:۔ کیسی بے وقوفوں کی سی باتیں کرتے ہو جی۔ بھلا کوئی مر کر بھی زندہ ہوا ہے؟

مُنیر:۔ انہیں تو سانپ نے کاٹا ہے یہ مَرے تھوڑے ہی ہیں۔ اچھی چچا جان قبر میں دفن نہ کیجئے۔ وہاں سینکڑوں مَن مٹّی کے نیچے یہ ضرور

مرجائیں گے

چچا:۔ کیا لغو باتیں کرتے ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ دو دو ڈاکٹروں نے اطمینان کرلیا۔ گھر کے سارے آدمیوں نے نبضیں دیکھیں، دل دیکھا، کنپٹیاں دیکھیں۔ اب بھی تمہیں یقین نہیں تو لو آؤ اچھی طرح اطمینان کرلو۔

"اطمینان اطمینان! ہائے اللہ میں کیا کروں۔" کہتا ہوا منیر تو چلا گیا۔ اب دونوں باپ بیٹے رہ گئے۔ اُن میں یوں باتیں ہوئیں۔

باپ:۔ کیسا بے وقوف لڑکا ہے۔ رنج و غم نے اس کے حواس کھو دیئے ہیں۔

بیٹا:۔ ابّا جان! سُنا تو میں نے بھی ہے کہ جن کے سانپ نے کاٹا ہو وہ کئی کئی دن کے بعد بھی جی اُٹھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مار گزیدہ جو بظاہر مر جائے اسے دفن نہ کرنا چاہیئے بلکہ نیم کی پتیوں میں اُسے اوپر تلے سے خوب ڈھک دینا چاہیئے۔

باپ:۔ تم بھی احمقوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

بیٹا:۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر بڑے ابّا کو ابھی دفن نہ کیا جائے۔ نیم کی پتیوں میں لاش گل سڑ بھی نہیں سکتی۔ منیر کی بھی خوشی ہوجائیگی اور جو بڑے ابّا زندہ ہوجائیں تو کیسی خوشی کی بات ہے۔

باپ:۔ اور جو آٹھ لاکھ روپے تمہارے چھن جائیں تو کیسی خوشی کی بات ہے۔

یہ سُنتے ہی بیٹا تو اچھل پڑا (اگرچہ اُچھلا نہ گیا) مگر نورالحسن اس رمز کو نہ سمجھ سکا اور پُوچھنے لگا

بیٹا:۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

باپ:۔ تم بھی نرے احمق ہی ہو۔ بی۔ اے تک پڑھ لینے کے بعد بھی عقل نہ آئی سنو تمہارے دادا ابّا تو ابھی زندہ ہیں۔

بیٹا:۔ جی ہاں۔ پھر؟

باپ:۔ پھر یہ کہ اُن کے انتقال کے بعد یہ ساری جائداد، روپیہ پیسہ، کاروبار، سب کا سب میرا ہوگا اور میری اولاد فقط تم ہو۔ اِسکے یہ معنی ہوئے کہ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔

بیٹا:۔ اور چچی جان اور اُن کے بچوں کا کیا ہوگا؟

باپ:۔ جہاں اُن کے سینگ سمائینگے چلے جائینگے ہمیں اِس کے متعلق اپنے دماغ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ شرعاً اور قانوناً اب اُن کا اِس جائداد میں کوئی حق و حصّہ نہیں۔ ہاں اگر تمہارے دادا ابّا پہلے مرجاتے اور بڑے ابّا بعد میں مرتے تو آدھی جائداد اور روپیہ پیسہ اُن کا بھی ہوتا۔

بیٹا:۔ ابّا جان! اگر بڑے ابّا کسی صورت سے زندہ ہو سکتے ہوں تو انہیں ضرور زندہ کیجئے۔ ہمیں سولہ لاکھ روپے نہ ملیں نہ سہی۔ آٹھ لاکھ کیا تھوڑے ہیں۔

باپ:۔ تم تو اُلّو ہو روپے کی قدر کیا جانو۔

بیٹا:۔ اگر درحقیقت بڑے ابّا مرے نہیں ہیں تو اِنہیں زندہ درگور کرنا یقیناً جرم ہے۔

باپ:۔ چُپ رہ بیوقوف۔ جرم ہے۔ جرم ہے۔ کیونکر جرم ہے۔ کیسے جرم ہے۔ دو دو ڈاکٹروں کی شہادت موجود ہے۔ سارے گھر والے نوکر چاکر گواہ ہیں کہ سب نے اچھی

طرح دیکھ بھال لیا نبضیں ساقط، دل کی حرکت بند کنپٹیاں ٹھنڈی برف. اور کیا ثبوت چاہیئے.
اس کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں باپ بیٹے چلے گئے. مگر اِن دونوں کی گفتگو سے
...ے اپنے سگے بھائی کے دل کا حال معلوم ہو گیا کہ روپے نے کس طرح اُس کا خون
...ید کر دیا. یہ وہی بھائی ہے جس نے ایک ماں کے پیٹ میں پرورش پائی، اُسی ماں کا
...دھ پیا جس کا میں نے پیا تھا اور جس کی رگوں میں میری طرح میرے باپ کا خون
...رہا ہے. ایک وہ بھی بھائی تھے جنہوں نے حضرت یوسف کو کنویں میں دھکا دیدیا
...ہ سوتیلے تھے. یہ سگا ہو کر مجھے زندہ در گور کئے دیتا ہے. دو دن بھی نہیں ٹھہر سکتا.

اِس کے بعد عزیزوں، رشتہ داروں نے میرا منہ کھول کر دیکھا. پنڈت
...! میں کس طرح بیان کروں اور کس زبان سے ادا کروں کہ میرے اپنے بچوں
...اور میری رفیقۂ حیات نے میرا منہ دیکھ کر کیا کہا اور کیا کیا. اب بھی جبکہ میں زندہ
...لامت آپ کے سامنے موجود ہوں. اپنی زبان میں وہ سین ادا کرنے کی طاقت
...یں پاتا.

اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُٹھانے کے لئے لوگ باہر سے آئے. اتنے
...میرے بیٹے منیر کی آواز کان میں آئی. بھاگا ہوا، گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا.

...ر:- چچا جان! ٹھہرئیے ٹھہرئیے. ابا کو ابھی نہ لے جائیے. پنڈت جی کے
پاس سے تار کا جواب آ گیا ہے. ابا جان جی جائیں گے. زندہ ہو جائیں
گے.

چچا نے اُسے ڈانٹ دیا اور لوگوں سے کہا کہ "یہ بیچارہ دیوانہ ہوگیا ہے جوان بیٹا ہے، سمجھدار ہے باپ کا غم نہیں سہ سکتا۔ سہ پہر سے برابر رو جا رہا ہے۔ دماغ بے قابو ہوگیا۔ اچھا۔ بسم اللہ کرو بھائی۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجع سب کو مرنا ہے۔ بھائی مٹی سے بنے اور مٹی ہی میں چلے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"۔

اِدھر تو میرا جنازہ اٹھا اُدھر منیر نے اپنی ماں سے جا کر کہدیا ہوگا۔ وہ عفیف دوڑی ہوئی آئی۔ ابھی جنازہ دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ اِدھر سے منیر نے کفن گھ شروع کیا اور اُدھر بیوی نے۔ مگر اِس ظالم بھائی نے سب کو دھکے دے دے گرا دیا۔ اور لوگ بھی یہی سمجھے کہ ماں بیٹے دونوں پاگل ہوگئے اور لگے دونوں ک سمجھانے بجھانے۔ اِتنی دیر میں میرا جنازہ بازار میں پہنچ گیا۔ میرا منہ ڈھکا ہوا تھا مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اُس وقت مغرب کا وقت ہوگا۔ راستے میں مجھے کئی منیر کے رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں اور میرا دل کٹتا رہا۔ مگر سب س زیادہ کوفت، پریشانی، مصیبت، صدمہ۔ غرض کیا بیان کروں سب سے زبردست دھکا میرے دل کو اُس وقت لگا جب مجھے لوگ قبر میں اُتارنے لگے اب رہی سہی امید بھی جاتی رہی کہ اب بھلا منوں مٹی کے نیچے دب کر کیونکر جی سکوں گ لوگ مٹی دے کر چلے گئے۔ کیونکہ مجھے کسی قسم کی آوازیں اب نہیں آئیں۔ ممکن ہے کہ اِتنی ساری مٹی کے نیچے مجھے آوازیں سنائی ہی نہ دی ہوں بہر حال میرا

...ال ہی تھا کہ لوگ چلے گئے ہیں۔

یہ دیکھئے کہ اس سارے عرصے میں میرا دماغ بالکل صحیح رہا۔ حالانکہ متواتر ...مانی صدمات پہنچتے رہے مگر اللہ ہی کو یہ منظور تھا کہ میرا دماغ صحیح رہے ...آپ کو سارے حالات من و عن سُنا سکوں۔ میں اب تک یہ سمجھے ہوئے تھا ...قبر پر پٹاؤ رکھنے اور اُوپر سے گیلی مٹی سے چھوٹے موٹے سوراخ بند کرنے ...بعد اور پھر اوپر سے منوں مٹی ڈال لینے کے بعد قبر کے اندر ہوا بالکل نہ جا سکتی ...گی۔ مگر میں زندہ تھا اور ہوش میں تھا۔ اگرچہ بے انتہا خوف زدہ ہو رہا تھا مگر تھا ...رہ۔ میرا اُس وقت یہ خیال ہوا کہ مٹی کے مسامات میں سے ہوا ضرور اندر ...ہو گی۔ کیونکہ اکثر سُننے میں آیا ہے کہ مکانوں کے گرنے سے منوں ملبے ...میں دبے ہوئے لوگ دو دو دن کے بعد نکلے ہیں اور زندہ رہے۔

غرض میں قبر میں بے بس پڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ یا تو تھوڑی دیر میں خودبخود ...اؤں گا یا کوئی جانور آتا ہی ہو گا وہ میری بوٹیاں نوچے گا۔ میں محسوس کروں گا ...چھ کر نہ سکوں گا۔ غرض میری دماغی کیفیت جو کچھ تھی بیان نہیں کی جا سکتی۔ مجھے ...حال میں شاید آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ بھر ہوا ہو گا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی قبر کا پٹاؤ ...رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں کوئی قبر کے اندر کودا۔ میں نے کہا لو بھئی اب تمہارا وقت ...گیا۔ اب کوئی دم میں یہ جنگلی جانور تمہاری بوٹیاں نوچے گا۔ مگر "ابا ابا!" میرے ...کی آہستہ اور پے در پے آوازوں سے میرا دماغ بلکہ تمام احساسات

خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ میں بول تو سکتا ہی نہ تھا جواب کیا دیتا۔ مگر مجھ سب کچھ رہا تھا۔ اب میرے منیر نے مجھے قبر میں سے بڑی مشکل سے نکالا۔ آخر بچہ تو تھا ہی بے چارہ ہانپ گیا۔ پھر جلدی جلدی وہ ساری مٹی قبر میں بھر دی کہ کوئی شبہ نہ کرے۔ اس کے بعد مجھے بمشکل تمام اُٹھا کر وہیں قریب ہی کسی دوسری جگہ لے گیا۔ میری آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ اور یہ دیکھ رہی تھیں کہ منیر میرے اُوپر جھُکا ہوا بڑے غور سے میری صورت تک رہا ہے۔ کبھی میرے پپوٹے اُوپر اُٹھاتا ہے کبھی جلدی سے میرے سینے پر کان لگاتا ہے۔ کبھی ہاتھ اُٹھا کر نبض دیکھتا ہے۔ کبھی کنپٹیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ غرض بے چین۔ کوئی ایک گھنٹہ یوں ہی گذر گیا۔ اس کے بعد ایکا ایکی میری رگوں میں خون دوڑتا ہوا معلوم ہوا۔ دل میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میرے اعضا، میرے قابو میں آ گئے۔ میں نے جلدی جلدی آنکھیں بند کیں۔ منیر یہ دیکھتے ہی "ابا ابا! میرے ابا" کہہ کر لپٹ گیا۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ پھر جو ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے مِل کر روئے ہیں تو بقول شخصے جل تھل بھر دیئے۔ دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دو چار منٹ میں جب ذرا دل قابو میں ہوا تو میں نے کہا۔

"بیٹا! میں تو دُنیا کے لئے مر ہی چکا تھا۔ تو نے مجھے دوبارہ زندگی دی ہے اللہ! کیا میں اپنے لختِ جگر کے اِس بارِ احسان سے سبکدوش ہو سکتا

ہوں۔"

اب ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ذرا خیال تو کیجئے میرے منیر نے میرے ساتھ کیا کیا۔ کیا کسی کی اولاد نے آج تک باپ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟

اس کے بعد میں نے منیر سے پوچھا

"بیٹا! یہ قبر سے نکلتے ہی میرے اعضاء میرے قابو میں کیونکر آ گئے۔ بتا تو سہی تو نے کچھ پڑھا ہے۔ کوئی عمل کیا ہے۔ کیا بات ہے؟"

منیر نے سارا قصہ بیان کیا کہ کس طرح اُسے اپنے دوست سے آپ کا حال معلوم ہوا کہ آپ مار گزیدہ کو تندرست کر دیتے ہیں، اور کس طرح اس نے چچا کی طرف سے مایوس ہو کر آپ کو جوابی تار بھیجا اور آپ کا جواب آیا کہ مار گزیدہ کا منہ کھول دو اور ہوا میں رکھو۔ میں عمل پڑھتا ہوں وہ ضرور زندہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ قبرستان میں آیا اور چھپا بیٹھا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو وہ فوراً قبر پر آیا اور مٹی ہٹا کر جلدی سے مجھے نکال لیا۔

میں نے منیر سے کہا کہ بیٹا میں اِس کفن کو لپیٹے ہوئے تو گھر جا نہیں سکتا تم جلدی سے جاؤ اور اپنی ماں اور دادا ابا کو اوّل سے آخر تک سب حال سُناؤ مگر دیکھنا عقلمندی سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شادی مرگ۔ ہو جائیں۔ تمہاری ماں کمزور دل کی عورت ہیں، اور دادا ضعیف العمر ہیں۔ پھر میرے کپڑے اور جوتی ٹوپی لے آؤ

تاکہ میں آدمی بن کر چلوں۔ جاؤ جلدی جاؤ میرا فکر نہ کرو۔ میں کفن کا تہمد باندھے لیتا ہوں۔ تمہیں یہیں ملوں گا۔ جلدی آنا۔

منیر تو اُدھر گیا اِدھر میں نے خاک پر سر رکھ کر اللہ پاک کی جناب میں سجدۂ شکرانہ ادا کیا۔ خوب روتا رہا اور توبہ استغفار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں منیر آگیا۔ گھر پہنچ کر جو حال میرا، منیر کا، منیر کی ماں کا، میرے والد بزرگوار کا اور میرے اور بچوں کا ہوا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ مجھے الفاظ ہی نہیں ملتے جن سے اُس وقت کی صحیح تصویر کھینچ سکوں۔ آپ اگر کر سکتے ہیں تو تصوّر کر لیجیے۔

جنّت کی ایک جھلک

ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مولوی کرامت اللہ صاحب تشریف لے آئے اور اپنے وعظ میں فرمانے لگے کہ عابدوں، زاہدوں، متّقی اور پرہیزگاروں کو اللہ پاک جنت الفردوس عطا کریگا۔ جہاں شہد اور دُودھ کی نہریں ہوں گی۔ انگور کی بیلیں ہوں گی۔ سیب۔ اخروٹ، بادام۔ انار وغیرہ میوہ جات کے درخت ہوں گے جس چیز کے کھانے کو جی چاہے گا بغیر توڑے خود بخود منہ میں آجائے گی۔ مزے سے کھائینگے طرح طرح کے خوشنما اور رنگ برنگ کے پرندے ہری ہری ڈالیوں پر بیٹھے چہچہا رہے ہوں گے جنّتی لوگوں کے رہنے کے لیے ایسے عالی شان محل ہوں گے کہ ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا راستہ پانچسو برس کی راہ ہوگا۔

بس جناب اِس پانچسو برس والے مضمون کو سُن کر ہمارے دل صاحب اٹک گئے، مچل گئے، لوٹ گئے اور ایسے بے قابو ہوئے کہ باقی ماندہ وعظ خاک بھی سُننے نہ دیا۔ بیچاری عورتوں کو ہم ناحق بُرا بھلا کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کے وعظ میں ہر وقت چھالیہ کترنے کی آواز چلی آتی ہے۔ ایک دم کھُسر پھُسر کئے جاتی ہیں

کوئی پان بنا رہی ہے۔ کوئی چھالیہ کتر رہی ہے۔ کوئی جمائیوں پہ جمائیاں لیے چلی جا رہی ہے۔ کوئی ایک دوسری سے گلے شکوے کر رہی ہے۔ غرض سب کام کریں گی مگر وعظ ہی نہ سُن کے دیں گی۔ تو بھئی اسی زمرے میں ہم بھی آئے ہمارا حشر بھی اُن ہی کے ساتھ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے عجیب و غریب دل نے وعظ نہ سُننے دیا۔ اُن کی سمجھ میں یہ پانچسو برس کی راہ والا مضمون مطلق نہ آیا اور بھئی سچی بات بھی ہے کہ ایسا مکان کس کام کا کہ ذرا دالان میں سے ڈیوڑھی تک بھی جانے کی ضرورت پڑی تو آنے جانے میں ایک ہزار برس لگ گئے۔

میں دفتر سے آ رہا تھا۔ تیس ہزاری کے میدان میں دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص، جو صورت اور لباس سے شریف آدمی معلوم ہوتا تھا، بے تحاشا بھاگا چلا چلا آ رہا ہے اور پیچھے پیچھے لڑکوں کی فوج ہے جو تالیاں پیٹ رہے ہیں اور چیخ چلا رہے ہیں۔ اس ہیئت کذائی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی پاگل ہے اور لڑکے اسے ستا رہے ہیں مگر اُس کی وضع قطع سے اِس خیال کی تکذیب ہوتی تھی۔ یہ حالت دیکھکر میں سائیکل سے اُتر پڑا۔ گاڑی درخت کے سہارے کھڑی کر کے اُس شخص کی طرف لپکا۔ اُس نے بھی مجھے آتے دیکھکر گڑگڑا کر کہا "خدا کے لئے مجھے اِس آفت سے بچائیے۔ میں پاگل ہوں تو نہیں مگر یہی حالت رہی تو ضرور ہو جاؤں گا۔"

میں نے بچّوں کو ایک ڈانٹ پلائی۔ اور دو ایک کے چپت بھی رسید کئے بچے تتّر بتّر ہوئے ہی تھے کہ میں نے اُس شخص کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے وہاں لے گیا جہاں میری سائیکل کھڑی تھی۔ پھر اُسے اپنے ساتھ لے کر تیزی سے چلا۔ قدسیہ باغ میں تنہائی کی جگہ جا کر ہم دونوں میں یوں باتیں ہوئیں۔ (اُس کی گفتگو اُردو اور فارسی کا مخلوط نمونہ تھی جس میں فارسی کے الفاظ زیادہ تھے اور اُردو کے کم۔ مگر میں یہاں اُردو ہی میں لکھتا ہوں)

میں:۔ آپ مجھے پردیسی معلوم ہوتے ہیں؟

شخص:۔ (ہنسکر) جی ہاں دیسی پردیسی۔

میں:۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

شخص:۔ میرا وطن یہی سرزمینِ پاک یعنی دہلی ہے۔

میں:۔ مگر بول چال سے تو آپ ایرانی معلوم ہوتے ہیں اور لباس آپ کا..... دیکھئے ٹھہریئے۔ ہاں یاد آگیا، زمانۂ شاہی کے فوجی آدمیوں جیسا ہے یہاں قلعہ میں ایک تصویر ہے۔ اس میں کچھ لوگ ایسا ہی لباس پہنے کھڑے ہیں۔

یہ سُن کر وہ شخص رونے لگا۔ درحقیقت رونے لگا۔ آنسو بہہ بہہ کر اُس کی ڈاڑھی پر گرنے لگے۔ اُس وقت مجھے بھی کچھ کھٹکا ضرور ہوا کہ یہ پاگل ہی ہوگا۔ اور بھئی سچّی بات ہے کہ مجھے ڈر بھی لگا۔ گو ہاتھ پاؤں میرے بھی خاصے لمبے تڑنگے ہیں اور بدن میں

کچھ جان بھی ہے مگر پاگل پھر پاگل ہی ہے۔ اُس میں بلا کا زور آجاتا ہے۔ اور جو یہ میرا گلا دبا دے تو میں کیا کروں۔ یہاں کوئی دور دور تک بھی نہیں جو مدد کو آجائے۔

خیر اس بات سے ذرا اطمینان تھا کہ اُس کی آنکھوں سے وحشت نہیں ٹپکتی تھی، تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ اُس کے بعد اُس شخص نے آنسو آستین سے پونچھکر کہا:۔

شخص:۔ میرا قصہ عجیب و غریب ہے۔

میں:۔ بسم اللہ سنائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔

شخص:۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ بھی مجھے پاگل نہ سمجھنے لگیں۔

میں:۔ خاطر جمع رکھیے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔ (میرے اس "آئندہ" کو وہ تو نہ سمجھا مگر آپ تو ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا؟)

شخص:۔ سنہ ۱۱۳۱ھ میں چونکہ عبداللہ خاں اور حسین علی ان ہی دو اُمراء کا دَور دَورہ تھا اور حقیقی معنوں میں یہ دونوں بادشاہ گر تھے۔ یعنی جسے چاہتے تھے تخت سے اُتار دیتے تھے اور جسے چاہتے تھے بادشاہ بنا تے تھے۔ انہوں نے محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ یہ سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق سنہ ۱۷۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت میری عمر ۹ برس کی تھی۔

میں نے جلدی سے کہا "آپ کی عمر ۹ برس کی تھی"؟

اب تو مجھے بھی یقین ہو چلا کہ یہ شخص پاگل ہی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ ۱۷۰۱ء میں پیدا ہوا تھا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس وقت اس کی عمر ڈھائی سو برس کے قریب ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ تیس بتّیس برس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اب میری باری تھی۔ وہ پاگل تھا یا نہ تھا اس وقت میرے چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور ڈر کے مارے بُرا حال ہوا جا رہا تھا۔

شخص:۔ جی ہاں میری عمر ۹ برس کی تھی۔ آپ کو ابھی سے بے اعتباری ہونے لگی تو اب آگے کیا کہوں۔ خدا کے لئے پہلے میرا حال اول سے آخر تک سُن لیجئے پھر کوئی رائے قائم کیجئے گا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ پہلے آپ مجھ سے ہر قسم کے سوالات کر کے اطمینان کر لیجئے کہ آیا میں پاگل ہوں یا نہیں؟

میں:۔ تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ اس وقت آپ کی عمر ڈھائی سو برس کے قریب ہے؟

شخص:۔ نہ صرف سمجھ لیجئے بلکہ یقین کر لیجئے۔ بغیر اس کے میں اپنا حال کیونکر بیان کر سکتا ہوں۔

میں:۔ میری عقل حیران ہے۔ نہ تو آپ کو پاگل سمجھ سکتا ہوں اور نہ آپ کی بات قابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔

شخص:۔ اس کا صرف ایک علاج ہے۔ وہ یہ کہ آپ چُپ چاپ میری داستان سُن لیں۔

میں:۔ فرمائیے

شخص:۔ میرا نام اعجاز حسین ہے۔ میرے والد کا نام الطاف حسین تھا۔ تھا اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ نہ صرف میرے والد یا والدہ یا دونوں بہنیں بلکہ میرے تمام دوست، احباب اور عزیز و اقارب اس دُنیائے ناپائدار سے چل بسے۔

یہ کہکر وہ شخص رونے لگا۔ بہت دیر تک روتا رہا۔ آخر جب کچھ جی ہلکا ہوا تو اُس نے پھر کہنا شروع کیا:۔

شخص:۔ میرے والد بادشاہ کے خاص مصاحبوں میں سے تھے۔ میں اپنی کمسنی کے زمانے میں سینکڑوں دفعہ محلات شاہی میں گیا ہوں جہاں کی شان و شوکت اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ میں نے شاہزادہ احمد شاہ کے ساتھ تعلیم و تربیت پائی اور فنونِ جنگ سیکھے اور بالکل شاہزادوں ہی کی طرح رہتا تھا۔ جب تک کم سن رہا بادشاہ سلامت کو ظل اللہ سمجھتا رہا مگر جُوں جُوں عمر زیادہ ہوتی گئی مجھے بادشاہ سلامت سے نفرت ہوتی گئی۔ ایک آدھ دفعہ والد بزرگوار کے سامنے بھی میرے منہ سے بادشاہ سلامت کے متعلق کچھ ناشائستہ الفاظ نکل گئے جس پر والد صاحب نے بڑی سخت تنبیہہ کی اور کہا کہ "ہمیں شاہوں کے افعال سے کچھ بحث نہ رکھنی چاہیئے۔ وہ چاہے جیسے کچھ بھی ہوں ہمارے مالک و والی اور خبرگیراں ہیں۔ ہم اُن کی جوتیوں کی بدولت دن رات عیش کرتے ہیں"۔ مگر میں رات دن

دربارِ خاص میں ایسی ایسی حرکتیں دیکھتا تھا کہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بعض اوقات تو بخدا یہی جی چاہتا تھا کہ بادشاہ اور اُس کے سارے بے حیا و بے غیرت مصاحبوں کو مار کر خود بھی مر جاؤں۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ چند حاسد درباریوں کے سکھانے بہکانے سے بادشاہ نے نظام الملک کو دکن سے بُلوایا اور اُس دیندار متقی، پرہیزگار اور سچّے مسلمان کی بھرے دربار میں بے حُرمتی کی اور اُس کے ساتھ نازیبا سلوک کیا۔ آخر انسان تھا فرشتہ نہ تھا۔ کیونکر اپنی اور اپنے سے زیادہ اسلام اور پاک دینِ اسلام کی ہتک ٹھنڈے پیٹوں گوارا کر لیتا۔ اُس نے بھی ایسا بدلہ لیا کہ بادشاہ سلامت جب تک جیتے رہے ہوں گے یاد کرتے ہوں گے۔ یہ نظام الملک ہی تھا جس نے نادر سے جلّاد کو محمد شاہ کے سر پر لا سوار کیا اور اُس کے ہاتھوں سلطنت لٹوا دی۔ سنہ ۱۱۵۱ھ مطابق سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ میری عمر اُس وقت ۲۹ برس کی تھی۔ میں بھی بادشاہ سلامت کے ساتھ ساتھ چالیس دن میں کرنال پہنچا تھا۔ بھلا اِس عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہ پچھتر میل کا فاصلہ چالیس دن میں طے کیا اور مزا یہ ہے کہ لڑنے جا رہے تھے کچھ سیر و تفریح مقصود نہ تھی۔ میں نے اپنی طرف سے تو یہ کوشش کی تھی کہ اُس لڑائی میں میرا خاتمہ ہی ہو جائے اور اسی وجہ سے جہاں گھمسان

کی لڑائی دیکھتا گھس پڑتا تھا مگر تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اپنے ایک۔ ایک عزیز کا ایک ایک دوست کا، اپنے محلوں کا، اپنے باغات کا، غرض اپنی ہر چیز کا ماتم کروں جیسا کہ آپ اِس وقت دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں سرفروشی کی غرض سے گھسا فوج کائی سی پھٹ گئی اور میری شجاعت کا شہرہ ہوا۔ مگر اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا نادر کے ساتھ اس میں شک نہیں کہ تھوڑی سی فوج تھی جو راستے میں کٹ چھٹ کر اور بھی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ مگر اُس فوج کا ہر فرد مرد تھا۔ اور یہاں نِرے بُزدل ہی بُزدل تھے۔ بھلا شیر بکری کی لڑائی کیا۔ وُہی بھیڑوں میں منہ نیچے کر کے کان لٹکا دیئے۔ مختصر یہ کہ لڑائی اور اُس کے بعد کے واقعات یکے بعد دیگرے سب میری اِن آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ اِس کے بعد میں کچھ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ ماں باپ اور دونوں چھوٹی بہنوں کی محبت بھی مجھے نہ روک سکی اور ایک دن میں چُپ چاپ گھر سے نکل ہی کھڑا ہوا۔ غصّے اور نفرت نے آنکھوں پر پٹّی باندھ رکھی تھی جس کی وجہ سے میں نے گھر سے روپیہ پیسہ کچھ نہ لیا۔ میں چاہتا تھا کہ دہلی سے دُور پرے کہیں جا کر کسی ریاست میں ملازمت کروں اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے مر جاؤں۔ پیٹ کی دوزخ بُری بلا ہے۔ اِس کے ایندھن کے لئے مجھے پہلے اپنی انگوٹھی بیچنی پڑی اور پھر اپنا رفیق، اپنا ہمدرد اور اپنا ہر وقت کا ساتھی گھوڑا۔ ایک دن وہ آیا جب میں

بے حال و پریشاں پیادہ پا ایک قصبے میں پہنچا۔ جو قصبہ کیا ایک بڑا گاؤں تھا۔ وہاں سرائے میں جا کر سرنگوں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بھٹیاری آئی اور پوچھنے لگی "میاں کیا پکواؤ گے؟" میرے پاس کیا رکھا تھا جو جواب دیتا۔ اُس کا منہ تک کر چپکا ہو گیا۔ وہ خبر نہیں کیا خیال کر کے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئی۔ اور وہی سوال کیا۔ اب کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے وہ پھر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی ایک عورت میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ کپڑے خاصے صاف ستھرے پہنے ہوئے تھی مگر میں اُسے بھی بھٹیاری ہی کی کوئی رشتہ دار سمجھا اور خیال کیا اب یہ بھی وہی سوال کرے گی اور یہ شاید مروّت نہ برتے گی اور صاف کہدے گی کہ چلتے بنئے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ عورت بولی:۔

عورت:۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

میں نے اُس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے دوبارہ بڑی نرمی سے وہی سوال کیا۔ اب کے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مگر منہ سے بات نہ نکل سکی۔ وہ عورت تھوڑی دیر تک چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھی اور جا کر سامنے کی کوٹھڑی میں سے پانی لائی۔ مجھے پلایا۔ جب دیکھا کہ میری حالت درست ہو گئی تو ہاتھ جوڑ کر بولی

عورت:۔ خدا کے لئے بتا دیجئے آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

میں:۔ مصیبت زدہ ہوں۔ اچھے دن گذر گئے اب تقدیر کا لکھا دہرا رہا ہوں۔

عورت :۔ آپ کا نام کیا ہے؟

میں :۔ مجھے لوگ اعجاز حسین کہکر پکارا کرتے ہیں۔

عورت :۔ آپ پٹھان ہیں؟

میں :۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) میرے باپ دادا سیّد کہلاتے ہیں

وہ عورت یہ سُن کر چلی گئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

کوئی پانچ ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ وہ عورت پھر آئی اور ایک بٹوا میری طرف بڑھا کر بہت ہی گڑگڑا کر بولی

عورت :۔ میں طوائف ہوں۔ ساری عمر میری حرام کاری میں گزری ہے مگر میں خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناظر سمجھکر کہتی ہوں کہ یہ چند اشرفیاں میں نے ٹوپیاں سی سی کر اور کرتے کاڑھ کاڑھ کر جمع کی ہیں اور اس لئے رکھ چھوڑی ہیں کہ میرے مرنے کے بعد اس رقم سے میری تجہیز و تکفین کی جائے۔ خدا گواہ ہے اس میں ایک پیسہ بھی حرام کی کمائی کا نہیں ہے۔ آپ یہ لے لیجئے میرا اللہ مالک ہے۔

میں یہ سُنتے ہی چیخیں مار مار کر رونے لگا ہچکی بندھ گئی۔ وہ چپکی بیٹھی دیکھتی رہی۔ پھر مجھے پانی پلایا جب ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو پھر کہنے لگی۔

عورت :۔ میر صاحب ! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ للہ مجھے محروم نہ کیجئے اس حقیر سی رقم کو قبول کر کے اپنے کام میں لائیے۔

میں جتنا انکار کرتا تھا اُتنا ہی اُس کا اصرار بڑھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے وہ بٹوا لینا پڑا۔

اب چاہے اسے اتفاق سمجھئے یا میری تقدیر مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ پھل اُن آٹھ اشرفیوں کی برکت تھی جو مجھے پندرہ ہی دن کے اندر ملازمت مل گئی۔ میں فکر معاش سے آزاد تھا۔ دربار شاہی کی کوفت اور گھٹن یہاں نہ تھی۔ گو ہمارے نواب صاحب بھی شراب پیتے تھے اور خاصے رنگیلے تھے مگر وہ بات نہ تھی۔ غرض میں خاصا خوش و خرم تھا۔ البتہ اپنے عزیز ہر وقت یاد آتے تھے اور سب سے بڑھکر اس بوجھ کو گلے سے اُتارنے کا فکر تھا۔

خیر میں نے کسی نہ کسی طرح ایک سال تو پورا کیا اور پھر بیس دن کی چھٹی لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اسی قصبہ کی طرف چل پڑا۔ چوتھے دن وہاں پہنچا اور سیدھا سرائے میں جا کر اُس طوائف کو پوچھا۔ بھٹیاری نے کہا کہ میاں وہ تو اب یہاں نہیں رہتی۔ کوئی سال بھر ہوا یہاں سے چلی گئی۔ میں نے کہا مجھے اُس سے بڑا ضروری کام ہے مہربانی کر کے اُس کا پتہ بتا دو۔ بھٹیاری نے کہا کہ نائی واڑہ میں جاکر مجّو طوائف کا گھر پوچھ لینا۔

میں نے اپنا گھوڑا بھٹیاری کے حوالے کیا اور سیدھا نائی واڑہ پہنچا۔ مُجّو کے

مکان پر دو آدمیوں کو دیکھا کہ پریشان سے بیٹھے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی گھنٹہ بھر ہوا مجّو کا انتقال ہو گیا۔ اب چندہ کر کے اُس کے کفن و دفن کا انتظام کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ کسی کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجّو کی تجہیز و تکفین کا سارا انتظام میں کروں گا۔ آپ کچھ آدمی جمع کر لیجیے تاکہ مرحومہ کو آخری منزل پہنچا آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم میت کو قبرستان لے چلے۔ وہاں جا کر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسے قبر میں کون اُتارے کیونکہ اُس غریب کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ میں نے یہ کہکر کہ یہ میری رشتہ دار تھی۔ یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ جس وقت کفن ہٹا کر مرحومہ کا منہ دیکھا ہے میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور دل پر چوٹ لگی۔ پچھلے سال کا واقعہ آنکھوں میں پھر گیا۔ خیر مٹی دیکر اور فاتحہ پڑھکر ہم سب واپس آ گئے میں سرائے میں آ گیا کچھ داموں کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا اندارد چالیس اشرفیاں تھیں۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ باؤلوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈھونڈھنے لگا۔ بھٹیاری نے پوچھا کہ ؎

کیوں میاں کیا ڈھونڈھتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا

میں اپنی بے اوسانی میں تھا جواب کیا دیتا۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اب کیا کروں گا خیر سوچتے سوچتے خیال آیا کہ اور تو کوئی بات سمجھ میں آتی نہیں ہو نہ ہو یہی بات معلوم معلوم ہوتی ہے کہ جب میں نے قبر میں اُتر کر جھک کر مجّو کا منہ کھولا تھا اُسی وقت جیب میں سے بٹوا گرا۔ قبر کا کھودنا خلاف شرع ضرور سمجھتا تھا۔ مگر اوّل تو اتنی بڑی

رقم، دوسرے میری ایسی بے سروسامانی کی حالت۔ غرض کچھ شرع ورع کا خیال نہ رہا۔ سیدھا قبرستان پہنچا۔ گاؤں کا قبرستان بستی سے دور وہاں کوئی آدم نہ آدمزاد میں نے ہاتھوں سے جلدی جلدی مٹی ہٹائی۔ پٹاؤ الگ کیا اور بغیر سوچے سمجھے اندر اتر گیا وہاں جاتے ہی کچھ اس قسم کی خوشبو آئی کہ دماغ سے اشرفیوں اور بٹوے کا خیال بالکل جاتا رہا۔ یہ معلوم ہوا کہ کسی باغ کی دیوار کے نیچے کھڑا ہوں۔ پہلو میں ایک کھڑکی نظر آئی۔ اُس میں سے جو سامنے دیکھا تو طبیعت بے قابو ہوگئی۔ چنانچہ کھڑکی میں قدم رکھکر دوسری طرف اُتر گیا۔ وہاں کیا دیکھا، ہائے کیا بیان کروں، اور کس دل سے بیان کروں۔ وہ دیکھا جسے ساری عمر دیکھے جاتا تو سیری نہ ہوتی۔ وقت جیسے صبح صادق۔ جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ۔ وہاں کی گھاس میں وہ مہک تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ پھول تو پھر پھول ہی تھے۔ جگہ جگہ صاف شفاف پانی کے چشمے۔ دودھ اور شہد کی نہریں۔ خدا کی قسم اس میں رتی برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔ ان آنکھوں نے، ہائے کیا بیان کروں، کیا دیکھا ایسے ایسے خوبصورت، خوشنما اور خوش الحان پرندے دیکھے جنہوں نے دل و دماغ کو آنکھوں کو اور کانوں کو سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ درخت نہایت گنجان اور سب کے سب میوے دار۔ کہیں سیب لٹک رہے تھے، کہیں ناشپاتیاں، کہیں انار، رنگتروں کے درختوں پر عجب بہار تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قمقمے لٹک رہے ہیں۔ میں اسی طرح سیر کرتا چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک بارہ دری دکھائی دی۔ میرے ہوش و حواس تو غائب تھے ہی، بلا تامل اُس کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک

جواہرات کا مرصع تخت ہے۔ اُس پر مُجّو ملکہ بنی ہوئی بیٹھی ہے۔ چاروں طرف خواصیں نہایت ہی اعلیٰ درجے کا لباس پہنے ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ مُجّو نے مجھے دیکھتے ہی جلدی سے کہا:-

مُجّو:- میر صاحب! یہ اپنا بٹوا لیجیے اور فوراً واپس چلے جایئے۔

مَیں:- یہ کونسی جگہ ہے اور تم یہاں کیسے آئیں؟

مُجّو:- یہ جنت ہے۔ خدائے پاک نے اپنی رحمت سے میری ساری عمر کے گناہ معاف کر دیئے۔ وہ جو اُس دن میں نے سیّد سمجھکر آپ کو کچھ اشرفیاں دی تھیں وہی فعل میرا اللہ میاں کو ایسا پسند آیا کہ مجھے خوش ہو کر جنت الفردوس عطا فرمائی بس اب آپ فوراً چلے جایئے اور لیجیے یہ اپنا بٹوا جو آپ بھول گئے تھے جلدی جایئے۔ بہت دیر ہو چکی۔

میں اس کے بہت مجبور کرنے سے بادلِ ناخواستہ وہاں سے چلا اور اُسی کھڑکی کے راستے سے باہر نکلا۔ قبر کو اُسی طرح ڈھانک کر وہاں سے چلا۔ مجھے قبر میں اُترے ہوئے دس منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے۔ مگر اب جو اپنے چاروں طرف نظر ڈالی تو دماغ چکرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جاگتا ہوں یا سو رہا ہوں۔ کہاں وہ چھوٹا سا قبرستان اور کہاں یہ بڑا سارا دُور تک پھیلا ہوا۔ جہاں پہلے بیس پچیس کچّی کچی قبریں تھیں وہاں اب سینکڑوں پکی قبریں دیکھیں جن میں سے بہتوں پر کتبے بھی لگے ہوئے تھے۔ میں حیران تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اسی حیرانی و پریشانی میں سرائے کی طرف چلا۔ اب جو دیکھا

ہوں تو نہ سرائے ہے، نہ بھٹیاری، نہ میرا گھوڑا، نہ گاؤں کے چھپر ہیں، نہ پھونس کے مکانات۔ بلکہ اب تو ایک خاصا شہر کا شہر نظر آیا۔ جہاں ایک دو نہیں سینکڑوں پکّے پکّے عالی شان مکان کھڑے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا سر چکرا گیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ خبر نہیں کب تک اس حالت میں پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ پانچ چھ شریف آدمی مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے ہیں میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ اس شہر کا کیا نام ہے اور یہ سن کر کہ اسے اٹاوہ کہتے ہیں میرے خیالات میں کچھ ایسا ہیجان شروع ہوا کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے انہوں نے بڑی ہمدردی سے میرا حال پوچھا، درجب میں نے مختصر طور پر اپنی سرگذشت سنائی تو غالباً مجھے پاگل سمجھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں دہلی کا راستہ پوچھ کر پیادہ پا چل پڑا۔ آج دوپہر کو یہاں پہنچا ہوں لال قلعہ اور جامع مسجد تو البتہ وہ کی وہی ہے مگر نہ خانم کا بازار ہے، نہ خان دوراں خاں کی حویلی بلکہ جامع مسجد سے قلعہ تک جہاں یہ بازار تھا، اب میدان ہی میدان ہے۔ جہاں کھاری باؤلی اور اس کا کنواں تھا، وہاں کھاری باؤلی کا بازار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمد شاہ کی حکومت کو دو سو برس ہوئے۔ اب تو انگریزوں کی حکومت ہے۔ ہائے میرے والد، والدہ، بہنیں اور سارے عزیز و اقارب کدھر گئے۔

یہ کہہ کر وہ شخص بڑی بے کسی سے رونے لگا۔ اُدھر وہ رو رہا تھا اِدھر مجھ پر ایک بے خودی کی حالت طاری تھی۔ اُسی حالت میں کسی نے مجھ سے کہا کہ دیکھ اور سُن اور سمجھ کہ جس خدا میں یہ قدرت ہے کہ ایک ناپاک قطرے سے اکبر جیسا شان و شوکت والا شہنشاہ پیدا کر دے، ایڈیسن جیسا عقل کا پُتلا بنا دے وہی قادرِ مطلق کائنات کے ذرّے ذرّے پر قابض و متصرّف ہے۔ ہر چیز اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے جس کو چاہے جیسا بنا دے اور کر دے۔ گڈریوں کو بادشاہ بنا سکتا ہے، بادشاہ کو دَم کے دَم میں فقیر کر سکتا ہے۔ آج جہاں سرسبز کھیت کھڑے لہلہا رہے ہیں کل وہاں سمندر بہا سکتا ہے۔ جب کائنات کی ہر شے اُس کے قبضہ و اختیار میں ہے تو زمانے اور وقت پر بھی اُسے پُورا پُورا قابو حاصل ہے۔ جنّت کے دس منٹ تیری دنیا کے دو سو برس کے برابر ہیں۔

اور اِس لئے غور کر اور سوچ کہ جس طرح تیری دُنیا میں قلعے اور محل اتنی وسعت کے ہوتے ہیں کہ ایک طرف سے دوسری طرف جاؤ تو بیس پچیس منٹ ضرور لگیں گے اُسی طرح جنّت میں جنّتی لوگوں کو اگر ایسے ہی وسیع محل مل جائیں تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ وہاں کے وقت کے لحاظ سے تو بیس پچیس ہی منٹ لگیں گے مگر یہاں کے لحاظ سے تو چار پانچ سو برس ہوں گے۔ یہی بات جتانے کے لئے

حکم دیا ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو ایک کان میں اذان اور دوسرے میں تکبیر کہو اور جب آدمی مرے تو بغیر اذان اور تکبیر کے نماز جنازہ پڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ اس نماز کی اذان اور تکبیر ہو چکی ہے۔ پس اِس طور پر ہم نے سمجھا یا ہے کہ انسان کی زندگی اتنی دیر کی ہے جتنی اذان و تکبیر اور نماز کے بیچ میں لگے۔

اب ذرا غور کرو کہ مغرب کا وقت ہے۔ ملّاجی نے اذان دی جماعت کھڑی ہو گئی۔ تکبیر کہی اور نماز شروع کر دی۔ بس یہ دو منٹ جو اذان و تکبیر اور نماز کے درمیان ہوئے۔ یہی انسان کی زندگی ہے۔ یعنی انسان کی زندگی کے ساٹھ ستّر برس دوسرے عالم کے دو تین منٹ کے برابر ہیں

اب میری سمجھ میں آگیا کہ مولویوں کے وعظ کا جو میں مذاق اُڑایا کرتا تھا کہ بالکل بے پَر کی اُڑاتے ہیں۔ یہ محض میری نادانی اور کم عقلی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی باتوں کے سمجھنے کے لئے اور ہی طرح کے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔

بس اب یہ بتانا اور رہ گیا کہ میں نے سید اعجاز حسین صاحب کا کیا بنایا۔ میں نے اُن کی وہ آنکھیں چُومیں جن سے انھوں نے دنیا میں جنّت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اُن سے محمد شاہ کے زمانے کی چالیس اشرفیاں لیں

جن کا سونا بالکل کھرا تھا اور بازار کے بھاؤ سے حساب کر کے سات سو روپے ان کو دیئے۔ اُسی میں سے سارا سامانِ سفرِ حج درست کیا۔ اِس لئے کہ اُن کے لئے یہی بہتر تھا کہ حج کو چلے جائیں اور تمام عمر خانہ کعبہ اور دیارِ حبیب میں بسر کردیں۔

(مطبوعہ "ساقی" جولائی سنہ ۱۹۳۰ء)

Reading
S.R. Rahi
Ajas (Kmr)

(15) period

تائیدِ ایزدی

Read by
عبدل حامد میر
ساکنہ شالامار سرینگر
ڈیپارٹمنٹ ہسٹری

1983 - 1984
previous
final

What is

G. N. [illegible] [illegible] of [illegible]
Student of Kashmir University
Department of [illegible] M.A.
1973

Student of Kashmir

تائید ایزدی

خان بہادر نصر اللہ خاں کے آباو اجداد تو کوہاٹ کے رہنے والے تھے مگر اِن کے والد حمید اللہ خاں ملازمت کے سلسلے میں دہلی آئے تھے۔ یہاں آنے کے تین سال بعد اُن کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دوست احباب کے بہت کچھ کہنے سُننے سے اُنھوں نے دہلی ہی کے ایک شریف خاندان میں شادی کرلی اور یہیں رہنے لگے۔

نصر اللہ خاں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پرورش پائی اور یہیں گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے۔ کی ڈگری لی۔ باپ بڑے حکام رس اور بارسوخ آدمی تھے اُن کی سعی سفارش سے پولیس انسپکٹر ہوگئے۔ آدمی قابل تھے بہت جلد ترقی کرگئے۔ اور مشہور ہوگئے جس زمانے میں یہ جالندھر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

تھے ممالک متوسط کی حکومت نے پنجاب گورنمنٹ سے ایک ہوشیار اور تجربہ کار پولیس افسر مانگا۔ یہ مشہور تو ہو ہی چکے تھے ان ہی کو بھیجد یا گیا۔ چنانچہ یہ سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر ساگر پہنچے۔ وہاں بھیلوں نے بڑا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آئے دن ڈکیتی لوٹ مار، قتل اور آتشزدگی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے جاتے ہی خاصی دھاک بٹھادی کتنے ہی ڈاکوؤں کو پکڑ پکڑ کر سزائیں دلوائیں مگر ان وارداتوں میں کمی نہ ہوئی۔ ڈاکو برساتی مینڈکوں کی طرح اُچھلتے ہی رہتے تھے۔ کبھی ادھر سے خبر آئی پانچ سات پکڑ لائے، کبھی اُدھر سے پتہ چلا دس بارہ گرفتار کر لائے پکڑتے پکڑتے تھک گئے مگر ڈاکوؤں کی ٹکسال کا پتہ نہ چلا کہ کہاں سے پیدا ہوتے ہیں بیچارے یوں ہی پریشان تھے کہ گھر سے بھی خط پر خط آنے لگے کہ چھٹی لے کر آجاؤ۔ بیوی بیمار تھیں۔ اُن کی دوا دارُو اور باقاعدہ علاج کرنا لازمی امر تھا۔ جانتے تھے کہ ایسی حالت میں کہ سر کھجانے کی مہلت نہیں، چھُٹی ملنی دُشوار ہے اسی لئے رخصت کی درخواست بھی نہیں دی تھی۔ غرض بیچارے ہر طرف سے بدحواس و پریشان تھے کہ ایک دِن تار ملا کہ بیوی کی حالت نازک ہے فوراً آجاؤ پڑھتے ہی بے اوسان ہو گئے اور تین مہینے کی رخصت کی درخواست دے ہی دی۔ مگر جیسا اِن کا خیال تھا، نامنظور ہوئی تو خود اپنے افسر اعلےٰ مسٹر ڈین کے پاس گئے اور کہا:۔

خانصاحب:۔ میں نے رخصت کی درخواست دی تھی مگر افسوس ہے کہ آپ نے

منظور نہیں کی۔

مسٹر ڈین:۔ خانصاحب! آپ بھی کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا خیال تو کیجئے کہ اس علاقے میں ڈاکو چیونٹیوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ تمام پولیس کو مدتوں سے انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ اب خدا خدا کرکے آپ ملے تھے آپ کی قابلیت، محنت اور کوشش سے اُن کا زور کم ہوا تھا۔ اب آپ بھی جانے کو کہہ رہے ہیں تو اللہ ہی حافظ ہے۔ بھلا میں آپ کو کیونکر چھوڑ دوں؟

خانصاحب:۔ یہ محض آپ کی قدردانی اور عزت افزائی ہے کہ آپ ایسا فرما رہے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکوؤں کی تعداد میں مطلق کمی نہیں ہوئی ہے بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

مسٹر ڈین:۔ نہیں خانصاحب! یہ بات نہیں ہے۔ آپ بڑے قابل آدمی ہیں جتنے ڈاکو آپ نے اس چھ مہینے کے عرصے میں پکڑے ہیں اتنے یہاں کی پولیس نے چھ برس میں بھی نہیں پکڑے تھے۔

خانصاحب:۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا

مسٹر ڈین:۔ ہمت نہ ہاریئے۔ نتیجہ اچھا ہی نکلے گا اور اب بھی یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ ساری پبلک آپ سے بے انتہا خوش ہے۔ ہمیں رتی رتی کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ سب لوگ آپ کو اپنا محافظ اور محسن سمجھتے ہیں اور ہمارے پاس آ آکر آپ کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ پرسوں دعوت میں سر جالس میوگو

نے خود اپنی زبان سے آپ کی بڑی تعریف کی اور دیر تک آپ کا ذکر کرتے رہے۔ اِن سب باتوں کے علاوہ خود ڈاکوؤں پر آپ کی ہیبت طاری ہو گئی ہے مجھے پورا یقین ہے کہ ایک سال کے اندر ہی اندر بہت سے ڈاکو گرفتار ہو کر سزایاب ہو جائیں گے اور جو باقی بچیں گے بھاگ جائیں گے۔

خانصاحب:۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ اب میں کیا عرض کروں اور کس طرح آپ کو سمجھاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا کام میں جی نہیں لگتا۔ کچھ اِس وجہ سے نہیں کہ میں ڈاکوؤں سے گھبرا گیا ہوں یا خوف زدہ ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ میرے دماغ کو سکون میسر نہیں، دل کو چین نہیں، بیوی دو مہینے سے بیمار ہے۔ اب تک میں اُس کی بیماری کو معمولی خیال کر کے ٹالتا رہا۔ پرسوں یہ تار آیا ہے جس نے میرے ہوش و حواس غائب کر دیئے۔ صرف تین مہینے کی بات ہے۔ آپ مہربانی کر کے چھٹی دیدیجئے۔ میں انشاء اللہ واپس آکر اِن کم بختوں سے اچھی طرح سُلٹ لوں گا، اور اگر آپ رخصت منظور نہ کریں گے تو پھر دردِ دلیش بجانِ درویش میں نہیں جاؤں گا۔ مگر آپ کا کام بجائے سنورنے کے اور بگڑ جائے گا اور میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گا۔

اِس گفتگو کے تین دن بعد شام کو خانصاحب کو شہر کے امراء اور

رؤسا کی طرف سے بڑے اعلیٰ پیمانے پر گارڈن پارٹی دی گئی جس میں سب نے ان کے جانے پر اظہار افسوس کیا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی بیماری کا عذر پیش کیا اور مجبوری ظاہر کی۔

جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے میں بیٹھکر کبھی آپ بمبئی گئے ہوں گے تو دیکھا ہوگا کہ بھوپال کے قریب سے پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بدنی اور ہوشنگ آباد کے علاقے میں یہ جنگل اور بھی گھنے ہو گئے ہیں۔ یہیں دریائے نربدا پیچ وتاب کھاتا ہوا بہتا ہے۔ نربدا کے بیچ میں ایک مقام پر کسی پرانی عمارت کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بکاؤلی رانی کا محل تھا۔ وہی بکاؤلی جس کا قصہ گل بکاؤلی کے نام سے مشہور ہے مگر اس محل تک جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اول تو جگہ بھیانک اور سنسان دوسرے عمارت پرانی اور ڈراؤنی، تیسرے یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اس محل میں دیو جن اور بھوت رہتے ہیں۔ راتوں کو وہاں آگ کے شعلے کسانوں اور راہگیروں کو دکھائی دیتے ہیں۔ محل میں سے شیروں اور چیتوں کے دہاڑنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ان وجوہ سے جو لوگ اُدھر سے گذرتے ہیں کبھی وہاں ٹھہر کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ایک آدھ دفعہ کئی شکاریوں نے چاہا

بھی کہ جا کر دیکھیں تو سہی ہے کیا بلا مگر ایک فرلانگ تک دلدل ہی دلدل ہے جو بظاہر گیلی گیلی ریت معلوم ہوتی ہے مگر جہاں قدم رکھا اور پاؤں دھنسنے شروع ہوئے اور جو کوئی صاحب کسی مرغابی کے پیچھے ہمت کر کے یا نادانستگی میں آگے بڑھ بھی گئے تو بس دس ہی قدم چلنے میں یہ حالت ہوئی کہ اب گھٹنوں تک دھنسے، اب کولھے بھی اندر ہیں۔ جتنا زور لگاتے ہیں اور اندر ہی دھنستے جاتے ہیں۔ ساتھی کنارے پر کھڑے چیخ چلا رہے ہیں مگر بے بس ہیں۔ کچھ کر نہیں سکتے۔ اگر چت لیٹ گئے تو کچھ دیر کے لئے بچ گئے۔ اس عرصے میں کہیں گاؤں سے رسّے تختے لائے گھاس پھوس ڈالا۔ غرض کسی ترکیب سے نکال لیا تو خیر۔ ورنہ گھنٹہ دو گھنٹے میں قصّہ تمام ہے اور دلدل اوپر سے پھر ویسی کی ویسی۔ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ ابھی ایک آدمی کو نگل چکی ہے۔ ایسا واقعہ جب کبھی ہو جاتا ہے تو اُدھر کے لوگ یہی کہتے ہیں کہ اندر ہی اندر جن اپنے محل میں لے گئے۔ اس جنگل میں اور خصوصاً اس سنسان جگہ دن دہاڑے لوٹ مار ہوتی ہے۔ مال و اسباب لوٹا اور مسافروں کو اسی دلدل میں غائب کر دیا۔ اب نہ لاش کا پتہ ہے، نہ کوئی ثبوت موجود ہے تفتیش ہو تو کیونکر؟

ایک دن جھٹ پٹے کے وقت پانچ آدمی خچروں پر کچھ صندوق، کچھ کپڑوں کی گٹھریاں لئے جا رہے تھے۔ اس مقام پر پہنچے تو چار آدمی ننگ دھڑنگ لنگوٹے

کسے. منہ پر ڈھاٹے باندھے. بڑے موٹے موٹے لٹھ تانے خبر نہیں کہاں سے نکل پڑے. اور ایک نے کڑک کر کہا اپنی خیر چاہتے ہو تو جو کچھ ہے رکھ دو. غریب راہگیر چیخنے چلانے لگے مگر ڈاکوؤں نے دو دو چار چار لٹھ رسید کر کے سب کو گرا دیا اور خچروں کو ہانک کر لیجانے لگے. کوئی بیس قدم گئے ہوں گے کہ دس بارہ ڈاکو اور کہیں سے نکل آئے اور اب دونوں طرف سے لٹھ بازی ہونے لگی. پہلی پارٹی میں سے ایک ڈاکو نے منہ میں اُنگلیاں دے کر زور سے ایک عجیب طرح کی سیٹی کی آواز نکالی جسے سُنتے ہی دس بارہ ڈاکو اور نکل آئے. اُن کے آتے ہی دونوں طرف والوں نے ہاتھ روک لئے. مگر اب ایک عجیب تماشا ہوا کہ یہ نئے آنے والے بجائے اس کے کہ اِن چاروں کی طرف داری کرتے جن میں سے ایک نے سیٹی بجائی تھی اُس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے اور اُن سے پوچھنے لگے کہ تم تو دس بارہ ہو ہمیں کیوں بُلایا ہے. کیا تم سب کے سب اِن چار آدمیوں کو کافی نہیں ہو. اُن میں سے ایک نے کہا:- تم میں سے کس نے سیٹی بجائی ہے

ڈاکو:- رام ادھین! ہم میں سے کسی نے سیٹی نہیں بجائی. یہ اس نے اشارہ کر کے بجائی ہے.

رام ادھین:- اُس شخص کی طرف مخاطب ہو کر تم کون ہو اور تمہیں اس طرح سیٹی

Nelam-of-Lagate

بجائی کس نے سکھائی؟

شخص:۔ میرا نام للتا ہے۔

رام ادھین:۔ (جلدی سے) للتا۔ للتا! کون؟ وہ ناسک والا للتا تو نہیں؟

للتا:۔ ہاں ہاں وہی۔

رام ادھین نے اپنی پارٹی اور دوسری پارٹی والوں سے کہا:۔

رام ادھین:۔ تم سب نے بڑی غلطی کی۔ ارے یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔ تم نہیں جانتے یہ وہی ناسک والے للتا ہیں جنہوں نے بمبئی کے علاقے میں اُودھم مچا رکھی ہے اور ساری پولیس کو حیران کر رکھا ہے۔ (پھر للتا سے کہا)

"مہاراج! آج ادھر کیسے براجمان ہوئے؟"

للتا:۔ جیونا' جو ہمارا دایاں بازو تھا' کالے پانی گیا اور بختاور پولیس کے مقابلے میں مارا گیا۔ دو ایک کچے آدمیوں نے پولیس کو ہمارا ٹھکانا بتا دیا۔ مجبور ہو کر ہم اپنے تین ساتھیوں کو لے کر ادھر چلے آئے۔ ہم نے کہا چلو اب جو کچھ تھوڑی بہت عمر باقی رہ گئی ہے تم ہی لوگوں میں گذار دیں گے۔ اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔

رام ادھین:۔ مہاراج! آپ نے بڑی کرپا کی جو ہم غریبوں کو یاد رکھا۔ آپ یہاں شوق سے اپنا گھر سمجھ کر رہیئے۔ آپ کو بھگوان کی دیا سے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو گی۔

ٹھاکر جی آپ کو پاکر بڑے خوش ہوں گے۔

للتا:۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ٹھاکر جی ہم سے ناراض نہ ہوں کہ اپنی گدی گنوا کر یہ منحوس یہاں حصہ بٹانے آیا ہے۔ بھیا پرمیشور نے ہمارا عیش و آرام سب چھین لیا نہیں تو آج اس حالت میں تمہارے پاس نہ آتے۔ کبھی ہمارا بھی وقت تھا ہم بھی ٹھاکر کہلاتے تھے۔ ہمارا حکم ہزار بارہ سو آدمی مانتے تھے

یہ کہکر للتا رونے لگا ہچکی بندھ گئی۔ اُس کے تینوں ساتھی بھی رونے لگے اس وقت جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں سے ایک آدمی نکل کر للتا سے لپٹ گیا اور کہنے لگا:۔

شخص:۔ للتا! روؤ نہیں۔ اچھا وقت گذر گیا تو اب سمجھو کہ بُرا بھی نہیں رہیگا۔ آج سے تم میرے بھائی ہو۔ میں نے تمہاری سب باتیں سُن لی ہیں اور مجھے تمہارا حال سُن کر بڑا افسوس ہوا۔ تمہارے آدمی بڑے نکمّے تھے کہ تمہاری قدر نہ کی اور پولیس کو کھوج بتا دیا۔ ہمارے آدمی ایسے نہیں ہیں۔ اِن کی کوئی کھال بھی کھینچ لے تو بھی ہمارے متعلق ایک لفظ زبان سے نہ نکالیں۔ اچھا آداب گھر چلیں۔ نمعلوم کب سے تم مارے مارے پھر رہے ہو گے۔

رام ادھین اور اُس کے ساتھیوں نے اِس نئے آنے والے کو دیکھتے ہی "ٹھاکر

جی پرنام" "ٹھاکر جی کی جے" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے جس سے للتا سمجھ گیا تھا کہ ٹھاکر جی یہی ہیں۔

اب خاصی رات ہوگئی تھی اور رات بھی اندھیری۔ کوئی میل ڈیڑھ میل گھنے جنگل اور پہاڑوں میں چلنے کے بعد ایک جگہ ایک تنگ راستے سے گذرے۔ اس مقام مقام پر دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ بیچ میں فقط اتنا راستہ تھا کہ دو آدمی مشکل سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ کوئی پچیس تیس قدم چلنے کے بعد اُلٹے ہاتھ کو مُڑے اور دس قدم چل کر ٹھاکر جی رُک گئے اور للتا سے بولے۔

ٹھاکر جی:۔ یہ وہ جگہ ہے جسے معلوم کرنے کے لئے گورنمنٹ لاکھوں روپے دینے کو تیار ہے۔ اس لئے کہ رام سنگھ ڈاکو جو ان شریف آدمیوں کا ٹھاکر ہے جس نے تمہیں اپنا بھائی بنا لیا ہے اور جو تمہارے سامنے اس وقت موجود ہے یہاں رہتا ہے۔ یہ اسی کے قابل دماغ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ اس نے اپنا اور اپنے رفیقوں کا مسکن ایسی جگہ بنایا ہے جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ جو جنوں اور بھوتوں کا ٹھکانا مشہور ہے۔ جہاں دروازے پر دلدل جیسا زبردست چوکیدار آٹھوں پہر موجود رہتا ہے۔ جو اس پر سے گذرنے والے کو پل کے پل میں ہڑپ کر جائے۔ پولیس کے ناکارہ اور احمق سپاہی تو درکنار دنیا کی بڑی سے بڑی

ہستی بھی اس دلدل کو پار نہیں کر سکتی۔ یہ تمہارے بھائی رام سنگھ ہی کا دماغ تھا جس نے یہاں سے وہاں تک اندر ہی اندر ایک سرنگ کھدوا ڈالی۔ کسی کو ہم پکڑ کر یہاں لاتے ہیں تو جس جگہ سے یہ تنگ راستہ شروع ہوا ہے وہیں سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔ مگر چونکہ اب تم ہم ہی میں سے ایک ہو گئے ہو اور ہمارے بھائی ہو اس لئے اب یہ تمہارا ہی گھر ہے اور یہ سب لوگ تمہارے اپنے بھائی ہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ ان سب جاں نثاروں کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور ان کو ہر طرح کی آسائش و آرام ہم پہنچاتا ہوں۔ تم بھی ہمیشہ ان لوگوں کو بھائی سمجھنا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بلتا تم جو میری ٹکر کے تھے آج مجھ سے مل گئے اور اب میرے ساتھ ملکر کام کرو گے۔ بھگوان کی کرپا سے اب تم دیکھنا کہ پولیس بغلیں جھانکتی پھرے گی حیران و سرگرداں ہو گی۔ یہاں کی گورنمنٹ کے بنائے جب کچھ نہ بنا تو پنجاب سے خانصاحب کو بلوایا اُسے بھی بھاگتے ہی بنی اور اب جو تم بھی ہم سے آن ملے تو دوسری جگہ کے پولیس افسروں کا بھی یہاں آتے ہوئے دم نکلے گا۔ کانوں پر ہاتھ دھریں گے۔

یہ کہکر رام سنگھ نے ٹارچ کی طرح کی کوئی چیز نکالی جس سے وہاں دھندلی سی

روشنی پھیل گئی اور ہنسکر کہا کہ یہ بھی ایجاد بندہ ہے۔ پھر پہاڑ کے ایک پتلے سے شگاف میں ہاتھ ڈالا۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور ساتھ ہی سامنے کی چٹان کا ایک بہت بڑا پتھر جو کئی ہزار من کا ہوگا، کچھ گڑگڑاہٹ کے ساتھ پیچھے کی طرف ہٹتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہٹنے سے ایک گز چوڑی زمین کھُل گئی۔ اُسی دُھندلی سی روشنی میں سب لوگ نیچے اُترے چوتھی سیڑھی پر کھڑے ہو کر رام سنگھ نے ایک پتھر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ دبایا۔ وہی چٹان کا بڑا پتھر پھر اپنی جگہ پر آگیا جس سے سوراخ بالکل ڈھک گیا۔ چونتیس سیڑھیاں اُترنے کے بعد آگے چلے۔ للتا کو بڑا تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ اگرچہ زینے کے اوپر چٹان کے بڑے پتھر نے سوراخ اِس طرح ڈھک دیا تھا کہ اُدھر سے ذرا سی بھی ہوا نہ آسکتی تھی لیکن دم گھٹتا ہوا مطلق نہ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی حیرانی دُور کرنے کے لئے اُس نے رام سنگھ سے پوچھا۔

للتا :- ٹھاکر جی! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اِس سُرنگ میں دَم کیوں نہیں گھُٹتا اِس میں کوئی روشندان بھی نہیں دکھائی دیتا مگر ہوا خاصی اچھی آرہی ہے یہ کیا بات ہے؟

ٹھاکر جی :- بھیا للتا! دونوں طرف کی دیواروں کو ٹٹولتے چلو تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو یہاں اس جگہ تو سُرنگ صرف ایک گز چوڑی ہے۔ مگر جوں

جوں آگے بڑھتے جاؤ گے یہ چوڑی ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ جب اس کے دہانے پر پہنچو گے تو دیکھو گے کہ چھتیس گز چوڑا منہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوا خوب اچھّی طرح سے آتی جاتی رہتی ہے۔ میں نے اِن باتوں کو پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ روشندان پہلوؤں میں رکھے نہیں جا سکتے۔ اس وجہ سے کہ اول تو دونوں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور اگر کہیں پتھر نہ بھی ہوئے تو بھی روشندان رکھنے مناسب نہ تھے۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ کبھی نہ کبھی پولیس کو یہ راستہ معلوم ہو ہی جائے گا۔ اوپر کی طرف اس لئے نہیں رکھ سکتے تھے کہ ایک فرلانگ تک تو دلدل ہی دلدل ہے۔ اِس کے آگے دریا زور و شور سے بہتا ہے۔ اگر کوئی انجنیر اِس سُرنگ کو دیکھے تو میری قابلیت کی داد دے اِس سرنگ میں ساری خوبیاں موجود ہیں۔ گو ایک بھی روشندان نہیں مگر جوں جوں آگے بڑھتے جاؤ گے روشنی ہوتی جائیگی۔ یہ معلوم ہوگا کہ صبح صادق کا وقت ہے۔ ہر وقت خوب تازہ ہوا آتی رہے گی۔ دَم بالکل نہیں گھُٹے گا پانی کی سطح سے اتنی نیچی ہے کہ پانی رِسنے کا بھی اندیشہ نہیں۔

للتا رام سنگھ کی قابلیت کی داد دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد زمین اونچی ہوتی ہوئی معلوم دی۔ سُرنگ کے اس رخ سیڑھیاں نہ تھیں بلکہ

زمین کو ڈھلواں کر دیا تھا۔ اب جوں جوں اوپر چڑھ رہے تھے ہوا خوب تیز ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ دہانے پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچکر للتا نے دیکھا کہ خوب گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے گھن دار درخت ہیں۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد اُسی پُرانے محل یا قلعے کا دروازہ نظر آیا۔ جو لوگوں کو دریا کے کنارے سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ محل باہر سے تو بالکل کھنڈر اور اُجاڑ معلوم ہوتا تھا مگر اندر پہنچ کر للتا نے دیکھا کہ اس میں ایک اچھا خاصا گاؤں آباد ہے۔ مکان سارے یک منزلہ ہیں مگر اچھے بنے ہوئے ہیں۔ دو چار دُکانیں بھی ہیں۔

رام سنگھ نے للتا کو اپنے خاص مکان میں ٹھیرایا اِس مکان کی آرائش و زیبائش اور ساز و سامان دیکھ کر للتا کی آنکھیں کھل گئیں۔ گو یہ بھی ایک بڑا ڈاکو تھا اور اِس نے بھی لُوٹ مار کا بہت سا مال و اسباب جمع کیا تھا مگر یہ ڈاکوؤں کی وضع سے رہتا تھا۔ برخلاف اِس کے رام سنگھ کسی ریاست کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔

کھانا دانا کھا چُکنے کے بعد رام سنگھ نے للتا سے کہا:۔

رام سنگھ:۔ اِس وقت تو رات ہے۔ کچھ دکھائی نہ دے گا تم صبح کو باہر نکل کر دیکھنا۔ دریا کے اُس پار سڑک پر آنے جانے والوں کو میری دُوربین کی مدد سے

بخوبی دیکھ سکو۔ مگر اس جگہ کا ایک آدمی بھی اُس پار کے لوگوں کو نہ دکھائی دیگا۔ کیونکہ یہاں درخت بڑی کثرت سے ہیں اور جھاڑیاں قدآدم اور گھنی ہیں پھر بھی احتیاطاً میں نے حکم دے رکھا ہے کہ جب تک کوئی نہایت ہی ضروری کام نہ ہو کوئی شخص دن کو باہر آزادی سے نہ پھرے چلے۔ قلعے کے اندر کے لوگ نہایت آزادی کے ساتھ رہتے سہتے ہیں۔ ہر طرح کی تفریح کے سامان مہیا ہیں۔ کھانا ہمارے ہاں سورج غروب ہونے کے بعد پکتا ہے اور دوپہر کا کھانا صبح ہونے سے پہلے ہی پک چکتا ہے۔ یہ اس لئے کہ دھواں لوگوں کو نظر نہ آئے۔ اکثر رات کو ہم جان کر طرح طرح کی چھوٹی بڑی روشنیاں قلعے کے باہر دکھاتے ہیں تاکہ اُس پار کے لوگ ہمیں جن بھوت سمجھیں۔ اکثر ہم شیر اور بھیڑیوں کی بھی آوازیں سُناتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اس جگہ سے خوف زدہ رہیں اور یہاں آنے کا کبھی بھول کر بھی نام نہ لیں

للتا رام سنگھ کے ساتھ مثل عزیزوں کے رہنے لگا۔ اُس نے تھوڑے ہی دنوں میں یہ اندازہ لگالیا کہ رام سنگھ خاصا پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی ہے۔ اُس کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شریف اور خاندانی آدمی ہے۔ تھا تو وہ ایک ڈاکو مگر جوں جوں اُس کے اندرونی حالات معلوم ہوتے جاتے تھے للتا کے دل

میں اُس کی قدرومنزلت اور زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ رام سنگھ پولیس کا جانی دُشمن تھا۔ پولیس والوں کی ہمیشہ بُرائیاں کرتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ میرا بس چلے تو ایک پولیس والے کو زندہ نہ چھوڑوں۔ چاہے وہ بڑا افسر ہو یا معمولی سپاہی۔ للتا نے اُس کے ساتھ رہ کر جہاں یہ دیکھا کہ اُس نے، جب کوئی پولیس والا اُس کے ہتھے چڑھ گیا اُسے بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا، وہاں یہ بھی دیکھا کہ غریبوں کی طرح طرح سے امداد کی۔ اُن کی بیٹیوں کی شادیاں خود خاص اہتمام سے کیں اور خود اپنے آدمیوں سمیت شریک ہوا۔ ایک دن للتا نے رام سنگھ سے پوچھا۔

22/2/76

للتا:۔ ٹھاکر جی آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں

رام سنگھ:۔ پوچھو۔

للتا:۔ میں نے اکثر آپ کو چھپ کر ایشور کی پرارتھنا کرتے دیکھا ہے اور اکثر تنہائی میں روتے ہوئے بھی پایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پرمیشر کی دیا سے آپ کو ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہے، آپ راجاؤں کی طرح رہتے سہتے اور حکومت کرتے ہیں۔ آپ کے جاں نثار تن من دھن سے آپ پر فدا ہیں، آپ کے ذرا سے اشارے کو اٹل قانون سمجھتے ہیں۔ پھر آپ کو کس بات کی پرواہ ہے۔

اور کیا غم ہے؟

رام سنگھ نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا

رام سنگھ :۔ اس سنسار میں سُکھ تو ہے ہی نہیں۔ جہاں جاؤ دُکھ ہی دُکھ پاؤ گے مجھے یقین ہے کہ یہ جتنے راجہ مہاراجہ ہیں یوں چاہے پرجا کی نظروں میں کیسے ہی طاقتور، مالدار اور خوش و خرم کیوں نہ ہوں مگر سُکھ سے نہیں ہیں سُکھ اس جہان میں ہے ہی نہیں۔ میرا جی پاپ سے بھر گیا ہے۔ بہت دنوں سے اس فکر میں ہوں کہ یہ پاپ کی زندگی چھوڑ کر سادھو بن جاؤں مگر اوّل تو یہ خیال ہے کہ ان لوگوں نے میرے کارن سب کچھ چھوڑا اور اب میں ان کو یوں منجھدار میں کیوں کر چھوڑ دوں، دوسرے یہ کہ سادھوؤں کی زندگی کو بھی دھوکے کی ٹٹی ہی دیکھا۔ میں نے بہتیرے سادھو دیکھ ڈالے سب کو پیٹ کا کتا ہی دیکھا۔ اس سارے سنسار میں مکر و فریب کا جال بچھا ہوا ہے آدمی آدمی کا دشمن ہے، جانور جانور کو کھائے جاتا ہے، پرند پرند کو نوچے ڈالتا ہے سب میں خود غرضی پھیلی ہوئی ہے، جو ہے اپنا ہی آپا دیکھتا ہے اور دوسرے کو کچلنے کی فکر میں رہتا ہے، دُنیا کی یہ حالت دیکھ کر رونا آتا ہے اور ہر وقت ایشور سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ ہے جگت سوامی میرے دل کو چین اور

سُکھ دے۔

للتا۔ ٹھاکرجی! اگر اجازت ہو تو مَیں بھی اپنے من کی بات کہوں؟

رام سنگھ۔ ہاں ہاں کہتے کیوں نہیں

للتا۔ مہاراج! ایک ڈاکو ہو کر اور ڈاکو بھی کیسا جس کا ثانی ہندوستان بھر میں نہیں۔ آپ کو ایسی سادھوؤں کی سی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ کے ایسے خیالات ہیں تو اِس پیشے کی سرداری کیسے نبھ رہی ہے۔ آپ تو کوئی بڑے دھرماتما معلوم ہوتے ہیں۔

رام سنگھ۔ تم میری ظاہری حالت کو دیکھ کر ایسا کہتے ہو اور تم کیا دُنیا ہی کا یہ حال ہے۔ کوئی کسی کے دِل کا حال نہیں پڑھ سکتا۔ للتا! اِن سب آدمیوں میں ایک تم ہی ایسے ہو جس سے میرا دِل مِلا ہے جو تم سے ایسی باتیں کر بھی لیتا ہوں ورنہ اور سب تو نوکروں کی طرح ہیں۔ مجھے اوتار سمجھتے ہیں۔ کبھی آنکھ مِلا کر بات نہیں کرتے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں اپنی رام کہانی سُناؤں سُنو گے؟

للتا۔ اگر ٹھاکرجی مہاراج سُنائیں تو میں اپنی عزت سمجھوں۔

رام سنگھ۔ اچھا تو سنو۔ میں ایک شریف گھرانے کا لڑکا تھا۔ میرے باپ

روہیلکھنڈ میں بہت بڑے زمیندار تھے۔ میں ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ آٹھ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی کہ اچانک پتاجی پر فالج گرا۔ دو مہینے بیمار رہ کر وہ بیکنٹھ باشی ہو گئے (آنسو پونچھ کر) مجھے سارا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ اب جو دولت کو جانچا اور اندازہ لگایا تو آنکھیں کھل گئیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جہاں شہد ہوتا ہے مکھیاں آتی ہی ہیں۔ مجھے بھی ہر طرف سے خوشامدیوں اور مفت خوروں نے آن گھیرا۔ مختصر یہ ہے کہ میں نے سارے کرم کیے۔ کوئی عیب نہ چھوڑا۔ بڑھیا ماں کچھ تو پتاجی کے غم میں ادھ موئی ہو گئی تھیں کچھ میرے کرتوتوں کا اثر پڑا۔ سال ہی بھر کے بعد پتاجی سے جا ملیں۔ ماتاجی کا ذرا لحاظ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ بدایوں میں کوئی شیاما نامی رنڈی پیلی بھیت کی آئی ہوئی تھی اُس کی بڑی تعریف سُنی۔ روپے میں سب قدرت ہے اُسے نوکر رکھ لیا۔ بدایوں کا تھانیدار کریم خاں بھی اُس پر جان دیتا تھا۔ ہم میں اُس میں چھڑ گئی۔ اُس کمینے دغاباز سے اور تو کچھ بن نہ پڑا، ایک دن کسی سے جھوٹی رپٹ لکھوا کر سرِ بازار ہماری تلاشی لی اور سونے کی دو انگوٹھیاں نہ جانے کیسے ہماری جیب سے نکل آئیں۔ ہم نے لاکھ زور لگایا پر سزا ہوئے بغیر نہ بچے۔ چھ مہینے تک جیل خانے میں رہے۔ ساری عزّت خاک میں مل گئی جیل

خانے سے نکل کر میں چاہتا تو اِس ٹھوکر لگنے سے سنبھل جاتا اور اِس واقعہ کو قدرت کا تازیانہ سمجھکر بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ روپیہ پیسہ بھگوان کا دیا سب کچھ تھا مگر میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اِس تھانے دار نے مجھے چور بنایا ہے تو چور ہی بن کر رہوں گا۔ میں پہلی بھیت گیا اور تھوڑے سے دنوں کی دوڑ دھوپ میں پتہ لگا کر ایک ڈاکو سے مِلا۔ اُسے سارا حال سُنایا اور اپنی سب جائداد بیچ باچ کر روپیہ اکٹھا کر کے اُسے دیدیا اور اُسی کے ساتھ رہنے لگا۔ سب سے پہلا وار میں نے اُسی تھانیدار پر کیا اور اُسے پکڑ کر چھ دن میں طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا۔ اِس سے میرا دل اور بھی سخت ہو گیا۔ بس جب سے یہی زندگی ہے۔ مگر اب جی بھر گیا لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیوں کر کروں؟

للتا پر اِس داستان کا بڑا اثر ہوا۔ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دونوں بالکل چپ تھے۔ رام سنگھ کے داغ میں بچپن سے لیکر اِس وقت تک کے سارے واقعات بائسکوپ کے سین کی طرح پھر رہے تھے۔ غرض دونوں چُپ تھے اور سرنگوں۔ تھوڑی دیر کے بعد رام سنگھ نے سر اُٹھایا اور کہا:۔

رام سنگھ:۔ میں نے ہر طرح کا عیش و آرام اٹھایا۔ بہتوں سے میری زندگی بہتے

بھی اچھی تھی اور اب بھی اچھی ہے مگر دل کو چین نہیں جسے اطمینانِ قلب کہتے ہیں وہ میسر نہیں۔ دل ہر وقت سُکھ کو ڈھونڈھتا رہتا ہے۔ مگر سُکھ نہیں ملتا۔ لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ میری یہ پاپ کی زندگی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ میں سُکھ کو ڈھونڈھتا ہوں سُکھ مجھے ضرور ملے گا۔ کیونکر ملے گا اور کب ملے گا یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مگر میرے دوست تم ان سب باتوں کو دل سے نکال دو۔ گویا سُنی ہی نہیں۔ مجھے یہ باتیں سُنا کر تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ نہ معلوم وہ کون سی طاقت ہے جس نے آج چودہ برس کے بعد یہ ساری باتیں مجھ سے کہلوا دیں۔ للتا! تم نے اپنی زندگی میں کتنے خون کئے ہیں؟

للتا اِس عجیب سوال پر چونک پڑا اور حیرت سے رام سنگھ کے منہ کو تکنے لگا۔

رام سنگھ:۔ (ہنسکر) بتاؤ بتاؤ۔ ہم سے چھپانے سے کیا فائدہ۔ تم بتاؤ پھر میں بھی بتاؤں گا۔

للتا:۔ گیارہ۔

رام سنگھ:۔ گیارہ آدمی اپنے ہاتھ سے مارے ہیں؟

للتا۔ اپنے ہاتھ سے۔

رام سنگھ۔ کبھی کسی پر رحم بھی آیا؟

للتا۔ مطلق نہیں۔ میں آپ کی طرح کسی جاگیردار کا لڑکا نہیں ہوں۔ میرے ہاں تو کئی پشتوں سے یہی پیشہ چلا آتا ہے۔

رام سنگھ:۔ میں نے اٹھائیس آدمی اپنے ہاتھ سے مارے ہیں اور کبھی کسی پر رحم نہیں کیا۔ اچھا یہ تو بتاؤ تم میرے آدمیوں کو کیا سمجھتے ہو؟

للتا۔ سب کے سب جاں نثار اور بہادر ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے یہ دو سو آدمی پولیس کے آٹھ سو پر بھاری ہیں۔

رام سنگھ:۔ میری پوری طاقت کا ابھی تم نے اندازہ نہیں کیا۔ اچھا دیکھو آج کے دسویں دن میری سالگرہ کا جشن ہوگا۔ اُس وقت میرے سارے آدمی موجود ہوں گے پورے پانچ سو جوان ہیں اور ایک سے ایک طاقتور، منچلا اور بہادر۔ اُس دن تم میری ساری دولت، روپیہ پیسہ، جواہرات اور ساز و سامان دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گے۔ دولت تو راجاؤں کے پاس بھی بہت ہوگی مگر جس شان کی میرے پاس ہے، تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ تم نے اس تھوڑے سے عرصہ میں چھ ڈاکے ڈالے ہیں اور ہر موقعہ پر بڑی بہادری دکھائی

ہے۔ اس جشن میں تم کو تمہاری وفاداری اور دلاوری کا ایسا صلہ دوں گا کہ خوش ہو جاؤ گے اور عمر بھر یاد رکھو گے۔

آج ٹھاکر جی کی سالگرہ کا جشن ہے۔ ہر شخص خوش خوش نظر آتا ہے۔ بستی سے دُور آبادی سے پَرے اِس وِیران سُنسان اور بھیانک مقام پر یہ ٹھاٹھ۔ اللہ اکبر! سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ساری آرائش وزیبائش انسانوں کے ہاتھوں سے ہوئی یا فی الحقیقت یہ جنوں کا کام ہے۔ قلعے کے باہر دُور پَرے سڑک پر سے گذرنے والوں کو یا پہاڑ کی پگڈنڈیوں پر چلنے والوں کو کیا خبر کہ قلعے کے اندر راجہ اِندر کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ دروازے سے لے کر شامیانے تک تمام روشوں پر رنگ برنگ کے کپڑے بچھے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔ آج اِن جنگلی اور خودرو، بے پھل کے درختوں پر بھی غضب کی بہار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنوں نے اصلی درختوں کو اُکھاڑ کر اُن کی جگہ پھلدار درخت لگا دیئے ہیں۔ وہ دیکھئے آم۔ جامن۔ امرود۔ ناشپاتی۔ انار اور سیب کے درخت پھلوں سے لدے جھوم رہے ہیں۔ ہائیں! ہائیں! یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ بس ہاتھ ہی نہ لگائیے۔ ورنہ سارا بھرم کُھل جائے گا۔ یہ سارے مٹی کے پھل ہیں۔ اور یہ دیکھئے۔ انگور کی بیلوں میں انگور کے خوشے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں

میانے کو دیکھکر خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ افوہ! کتنا بڑا شامیانہ ہے۔ بھلا
کا یا کیسے ہوگا؟ سچ مچ اس میں تو پانچسو کیا' ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور ذرا
ھنا یہ پریاں یہاں کیسے آگئیں۔ لو دیکھو تو سہی۔ اِن کے تو پر بھی ہیں۔ ارے
ں یہ کون سی مخلوق ہے؟ اچھا یہ دیو ہیں۔ اِن ہی کو دیو کہتے ہیں۔ بڑی ڈراونی
یں ہیں۔ ہاں یہ بیچ میں راجہ اندر بیٹھے ہیں۔ اچھا یہ ہیں ٹھاکر جی مہاراج
دائیں طرف للتاجی ہیں اور بائیں جانب رام ادھین۔ اچھا آج ٹھاکر جی مہاراج
سالگرہ کا جشن ہے جب ہی تو یہ پانچسو آدمی دربار میں موجود ہیں۔

ٹھاکر جی مہاراج کے اشارے پر خزانچی نے پہلے جواہرات کی صندوقچیاں
نی شروع کیں۔ ہیرے جواہرات کی جوت سے تمام فضا جگمگ جگمگ کرنے
س کے بعد روپوں کے توڑے لالا کر ڈھیر لگا دیا۔ پھر کپڑوں کی باری آئی
ان ہاتھی دانت اور آبنوس کی نہایت اعلےٰ درجے کی بے شمار
سزیں آئیں۔ غرض جہاں جہاں تک نظر پہنچ سکتی تھی ساز و سامان ہی
دیتا تھا۔

جب یہ نمائش لگ چکی تو رام سنگھ کھڑا ہوا اور یوں کہنا شروع کیا۔
سنگھ :۔ میرے دوستو، میرے بھائیو! یہ تمام ساز و سامان دیکھ کر اور تم

سب جاں نثاروں کو یہاں موجود پاکر جو کچھ اِس وقت میرے دل کی حالت ہو رہی ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ آج تم سب لوگوں کو میں نے اِس لئے جمع کیا ہے کہ تم سب میرے ساتھ بیٹھکر کھانا کھاؤ۔ چونکہ دیر بہت ہو چکی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کھانے سے فراغت پالیں اور پھر سب لوگ اپنی اپنی پسند اور مرضی کی تفریحات میں مشغول ہو جائیں۔ مگر مجھے چند نہایت ضروری باتیں کہنی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے بھائی تھوڑی دیر کے لئے مجھے معاف کریں گے اور کچھ کہنے کی اجازت دیں گے۔ میرے بھائیو! آج میں تمہارا تعارف ایک ایسے شخص سے کراتا ہوں جس کو جان کر اور پہچان کر تم بہت ہی خوش ہو گے۔ وہ میرا بھائی للتا ہے۔ یہ وہی للتا ہے جو ناسک والا للتا کہلاتا تھا جس نے سارے بمبئی کے علاقے کی پولیس کے چھکے چھڑا دیئے تھے جس کے نام سے پبلک تو درکنار خود پولیس کے بڑے بڑے افسر تھرّاتے تھے آج دو مہینے سے یہ ناسک والا للتا ہماری قسمت سے ہمیں مِل گیا اور ہمارے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔ میرے پیارے بھائی للتا! میں اپنے دیگر بھائیوں کا بھی تعارف کراتا ہوں۔ دیکھو یہ میرے دستِ راست مدن ہیں، اور یہ میرے قوتِ بازو گوپال ہیں، اور یہ میرے بیل تن سکھدیو ہیں، اور یہ میرے رن بیر

مادھوہیں۔ اور یہ اور سب کے سب میری حکومت، میری طاقت اور میری قوت کے پُرزے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ نہایت مفید اور ضروری ہے۔ آؤ اِن سب سے گلے ......

رام سنگھ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ سکھدیو جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ...سے لگا:۔

سکھدیو:۔ ٹھاکر جی مہاراج! یہ سچ ہے کہ للتا کی طاقت ٹوٹ گئی۔ پولیس نے اُس کے تقریباً سارے آدمی پکڑ لئے اور للتا کو بھی پکڑ لیا تھا مگر وہ کسی ترکیب سے بچ نکلا اور چھپتا چھپاتا، بچتا بچاتا کسی نہ کسی طرح میرے پاس پہنچ گیا۔ مگر وہ للتا یہ شخص نہیں ہے۔ آپ کو بہت بڑا دھوکہ دیا گیا ہے۔ میں للتا کو بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ شخص ہرگز للتا نہیں ہے۔ یہ ضرور کوئی پولیس کا آدمی ہے میں للتا کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنے لایا ہوں۔ آؤ بھائی للتا آگے آؤ۔

یہ سُنتے ہی ایک شخص دوڑ کر ٹھاکر جی کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے بعد ...منٹ تک سناٹا رہا۔ پھر ٹھاکر جی مصنوعی للتا کی طرف بڑھے اُس نے مُنہ ...دو انگلیاں ڈال کر بڑے زور سے سیٹی بجائی اور مقابلے کے لئے پینترا ...کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے تینوں ساتھی بھی مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُسی وقت

شامیانے میں پولیس کے آٹھ نو سو آدمی گھس آئے جن کے آگے مسٹر ڈین تھے۔ انہوں نے آتے ہی کڑک کر کہا:۔

مسٹر ڈین: خبردار! کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے ورنہ مار دیا جائے گا۔ تم سب نہتے ہو اور ہم سب کے سب مسلح ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے شامیانے کے باہر چار سو سپاہی موجود ہیں۔

غرض تھوڑی سی معمولی سی ہاتھا پائی کے بعد پولیس نے سب کو جکڑ لیا اور لیکر چلے۔ راستہ میں مسٹر ڈین نے للتا سے ہنسکر کہا:۔

مسٹر ڈین:۔ ہاں مسٹر للتا! اب مہربانی کر کے اپنا قصہ سنائیے۔

للتا:۔ میں جب سے ساگر کی پولیس میں تعینات کیا گیا تھا اس فکر میں تھا کہ کسی طرح ڈاکوؤں کے رہنے کا مقام دریافت کروں مگر چھ مہینے تک مجھے مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اور اب آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسی حالت میں کہ یہ کمبخت اس ویران اور اُجاڑ قلعہ میں رہتے ہیں۔ زمین کے اندر ہی اندر سُرنگ بنا رکھی ہے۔ ایک خاص کل دبانے سے ہزاروں من کا وزنی پتھر اس طرح ہٹتا اور ڈھک جاتا ہے گویا آدھی چھٹانک کا کوئی پرزہ ہے۔ دریا کی طرف سے قلعہ تک جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ دلدل کو پار کر نہیں سکتے۔ بھلا

ایسی حالت میں اِن کی جائے قیام کا پتہ ملنا کیسے ممکن تھا اور یہ خیال ہی کیسے ہو سکتا تھا کہ جہاں کوئی کسی طرح نہ پہنچ سکے وہاں ڈاکو پہنچ گئے ہوں گے اور رہتے ہوں گے۔ اِدھر ڈاکوؤں کی یہ حالت تھی کہ جیسے زمین سے اُبلے پڑتے ہیں اور پھر آدمی بھی اِس بلا کے کہ اگر پکڑے گئے تو کیا مجال کہ ذرا سا پتہ نشان تو دے دیں۔ مارتے مارتے کھال اُدھیڑ دو مگر منہ سے بولتے ہی نہیں اور جو بولیں گے تو الٹکل پچو۔ مجھے ایسی پریشانی اپنی ساری ملازمت کے عرصے میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جیسی اِس سرزمین پر آکر ہوئی اِس بات کا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اِس تمام مشین کا چلانے والا ایک دماغ ہے جس کی قابلیت میں کوئی شک نہیں۔ یہ شخص میرے ارادوں تک سے واقف ہو جاتا تھا اور میری ہر چال کا توڑ کر جاتا تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ اندھیرے میں ٹٹولتا رہ جاتا تھا۔ ایک دن یہ تدبیر میری سمجھ میں آئی کہ میں رخصت لیکر اِن کی تلاش میں مصروف ہو جاؤں۔ جب اِن لوگوں کو میرے جانے کا یقین ہو جائے گا تو ذرا نڈر ہو کر اپنی کارروائیاں کریں گے۔ چنانچہ میں نے بڑی جدو جہد سے آپ سے چھٹی لی اور اپنے اِس فرضِ منصبی کے آگے آپ کی ناراضگی اور خفگی کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ اُس دن شام کی گارڈن پارٹی نے ڈاکوؤں کو یقین دلا دیا کہ میں دفع ہو گیا۔ مزید احتیاط کے لئے میں نے دہلی کا ٹکٹ بھی

خرید لیا اور ریل میں سوار ہو گیا مگر بینا کے اسٹیشن پر اتر پڑا۔ اپنا بھیس ریل ہی میں بدل لیا تھا۔ اس لئے اگر کوئی ساتھ بھی ہو گا تو بینا کے اسٹیشن پر پہچان نہ سکا ہو گا۔ وہاں سے ریل میں سوار ہو کر بدنی گیا اور اپنے سادھوؤں کے بھیس میں جنگلوں میں پھرتا رہا۔ اس میل بھر کے علاقے میں بہت دنوں تک پھرتا رہا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکوؤں کا مسکن یہیں کہیں کسی غار میں ہو گا۔ جب بیس بائیس روز مجھے یوں ہی پھرتے پھرتے ہو گئے تو آخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ میں ہوشنگ آباد گیا اور وہاں سے آٹھ آدمی، پانچ خچّر اور کچھ سامان لیا۔ پانچ آدمیوں کو خچّروں کے ساتھ چھوڑا اور ارجمند، فیض اللہ اور رحیم خاں کو لیکر میں الگ چلا گیا۔ جب اُس جگہ پہنچے تو ہم چاروں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ بظاہر لٹھ چلا کر انہیں گرا دیا مگر دراصل اُن کے چوٹ کہیں نہیں لگی۔ ہماری اُمید کے مطابق کچھ ڈاکو نکل آئے اور ہم سے مقابلہ کرنے لگے۔ میں نے اِتنے دنوں میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ ڈاکو اِس قسم کی سیٹی بجا کر ایک دوسرے کو بُلاتے ہیں۔ چنانچہ اِسی طرح سے میں نے سیٹی بجائی۔ جسے سُنتے ہی دس بارہ ڈاکو نکل آئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اِن کے آدمیوں نے سیٹی نہیں بجائی تو

مجھسے میری بابت پوچھنے لگے۔ میں نے اپنا نام للتا بتا دیا۔ اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ للتا کے آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے اور وہ خود کسی طرح سے بھاگ نکلا اور چھپا چھپا پھر رہا ہے۔ یہاں میں ٹھاکر رام سنگھ کا، جو اِن سب کا سردار ہے، منظورِ نظر بن گیا اور سارے حالات رفتہ رفتہ معلوم کر لیئے۔ رام سنگھ نے جب اپنی سالگرہ کے جشن کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ بس اب موقعہ ہے۔ ایسے وقت میں اِن پر چھاپا مارا جائیگا تو ایک ڈاکو بھی بچنے نہ پائے گا اور اِن سب کا بالکل ہی قلع قمع ہو جائے گا۔ چنانچہ میں کچھ بہانہ کر کے آپ کے پاس پہنچا اور مختصر سا حال کہہ کر جلدی سے واپس آگیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے میری محنت ٹھکانے لگائی۔

مسٹر ڈین جوش میں آ کر خانصاحب سے لپٹ گئے اور بولے۔

مسٹر ڈین:۔ خانصاحب! میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا کام یہ کیا کہ آپ کو پنجاب سے بلوایا۔ یہ ہمارے محکمہ کی خوش قسمتی تھی کہ آپ جیسا لائق، قابل، مدبر اور تجربہ کار افسر ہمیں مل گیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ پانچ سو ڈاکوؤں کا گروہ، باقاعدہ اور تنظیم شدہ گروہ ایک وقت

میں پکڑا گیا۔ اور اتنی دولت ہاتھ آئی جو میرے خیال میں ایک کروڑ سے کم نہ ہوگی اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے خطابات بھی ملیں گے، انعام بھی ملیں گے، عہدے میں بھی ترقی ہوگی مگر میرے خیال میں وہ سب کچھ آپ کی قابلیت کے آگے ہیچ ہوگا۔

اُسی دِن شام ہونے سے پہلے پہلے خاں صاحب کے نام کا ڈنکا اخباروں میں بجنے لگا۔ خانصاحب کے بنگلہ پر اُمراء اور رؤسا کا تانتا بندھ گیا۔ پبلک نے بڑی دھوم دھام سے خاں صاحب کا جلوس نکالا۔ دوسرے دِن بڑے ٹھاٹھ کی دعوت ہوئی۔ رؤسا کی طرف سے بائیس طلائی تمغے پیش ہوئے۔ اِدھر گورنمنٹ کی طرف سے "خان بہادر" اور سی۔ آئی۔ ای کے خطابات بیک وقت سے ملے۔ دو ہزار روپے نقد عطا ہوئے۔ تنخواہ میں دو سو روپے کا اضافہ ہوا اور لائل پور میں چھ مربعہ زمین ملی۔

اِن واقعات کو پانچ برس گذر گئے۔ خان بہادر نصر اللہ خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ امرتسر میں تبدیل ہو کر آ گئے۔ بیوی دِلّی والی تھیں۔ میاں کے پاس جب ہُن برسنے لگی، ہر طرف روپیہ ہی روپیہ دکھائی دیا تو ہتھیلیوں میں کھُجلی ہونے لگی، پہلے

تو ذرا ہلکے سُروں میں الاپتی رہیں

"اے دیکھنا! جی چاہتا ہے کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہمارے ہاں بھی ہو

"وہ امجد میاں کے ختنوں کی شادی تو تم کرتے ہی رہے۔"

پھر ذرا اِسی کو دُگن میں الاپنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اُنترے میں کہہ ہی دیا

بیوی:۔ اے نوج۔ ایسی بھی آنکھوں پر پٹّی نہ باندھ لینی چاہیئے۔ تمہاری بھی وہی مثال

ہوئی کہ جتنی مُرغی موٹی ہوئی اُتنی ہی دُم سُکڑی۔

خانصاحب:۔ بیگم میں کئی دن سے سُن رہا ہوں۔ آخر یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ کیوں جہالت

کی باتیں کرتی ہو؟

بیوی:۔ لو اور سنو۔ اب ہم جاہل ہو گئے۔ ابھی تو دیکھتے جاؤ کیا کیا خطاب ملتے ہیں۔

خوب اللہ کا شکرانہ بھیجا۔ تمہیں خان بہادری کا خطاب ملا۔ سی۔ آئی۔ ڈی

اور خدا جانے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ کیا کیا بنے اور ہمیں .....

خانصاحب:۔ (جلدی سے ہنسکر) کیوں فضول باتیں کرتی ہو۔ مَردوں کی جان بھی عجیب

مخمصے میں ہے۔ عورتوں کو تعلیم دلاؤ تو آج زنانہ کانفرنس میں جا رہی ہیں، کل

بے بی شو ہے۔ پرسوں بیگم سر محمد عظیم کے ہاں ایٹ ہوم ہے۔ کبھی سوراج پر

لکچر ہو رہے ہیں، کہیں کانگریس میں تقریر کر رہی ہیں۔ کبھی جھنڈے لے لے کر

ہوم رول لینے نکلی ہیں۔ اور تعلیم نہ دلاؤ تو اپنی جہالت سے ناک میں دم رکھتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا خطاب مل گیا اور اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ کا خطاب مل گیا۔ لاحول ولاقوۃ۔ کسی پہلو چین نہیں۔ غریب مردوں کی مٹی پلید کر رکھی ہے

بیوی:۔ تم تو لڑنے کو تیار بیٹھے رہتے ہو۔ جہاں منہ سے بات نکلی اور بگڑ گئے۔ آخر جانتے تو تھے کہ ہندوستانی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پھر شادی کرنے کی کیا پڑ گئی تھی؟

خانصاحب:۔ لڑتی تم ہو یا میں؟ میں نے تو ایک سیدھی سی بات کہی تھی تم لگیں بگڑنے

بیوی:۔ کیا کہنے ہیں آپ کی سیدھی سی بات کے! اور خدا جانے الٹی بات کیسی ہوتی ہوگی۔ خیر جی میں الٹی سیدھی کچھ نہیں جانتی مجھے دلی بھجوا دو، اور پھر جو تمہارا خدا دلوائے بھیجنا چاہے نہ بھیجنا۔

خاں صاحب:۔ استغفر اللہ! کیا باتیں کر رہی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بگڑنے کی بات تھی؟

بیوی:۔ میں بیچاری بگڑنے والی کون جاہلِ مطلق موئی کندۂ ناتراش

خاں صاحب:۔ اچھا اب جانے دو غصے کو تھوک دو۔ سیدھی طرح بات کہو کیا چاہتی ہو؟

بیوی:۔ تم مردوں نے یہی سمجھتے ہو کہ ہم کما کر لاتے ہیں تو بڑا تیر مارتے ہیں۔ میں سچ کہتی
کہ ہم عورتیں نہ ہوں تو تمہاری خاک بھی عزت نہ ہو۔ یہ ہمارا ہی جگرا ہے کہ بچو
کو پالیں پوسیں، گھر میں اندر باہر کا انتظام کریں۔ مہینہ بیس دن کے
چلی جاتی ہوں تو گھر اوندھا ہو جاتا ہے۔ مُنوں کوڑے کا انبار لگ جاتا
تم مردوں کو اور تو اور جھاڑو تک تو دینی آتی نہیں۔

خانصاحب:۔ بالکل بجا فرمایا۔ اور کچھ ارشاد ہو۔

بیوی:۔ اب قائل ہو گئے تو لگے بات کو مذاق میں اُڑانے۔

خانصاحب:۔ اچھا بھئی میں ہارا تم جیتیں۔ اب بات کہو بات

بیوی:۔ بات وات کیا ہو گی۔ تم تو ہمیشہ پردیس میں رہتے ہو۔ تمہیں کیا
خبر کہ دُنیا کیا کہتی ہے۔

خانصاحب:۔ کیا کہتی ہے؟

بیوی:۔ کہتی ہے کہ سب کے حصے بخرے کھاپی کے بیٹھ گئے۔ اپنے ہاں کوئی
کاج کرنا نصیب نہیں ہوتا۔

خانصاحب:۔ خواہ مخواہ کونسا کاج کر دوں۔ امجد چھ برس کا ہے نعیمہ چار برس کی
ہے۔ ابھی دونوں کے کاج دُور پڑے ہیں۔

بیوی :۔ واہ وا۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ کاج کیا شادی بیاہ ہی کو کہتے ہیں۔ لو اور سنو اجی۔ آدمی اِرادہ تو کرے کاج ہی کاج پیدا ہو جاتے ہیں۔ کسی تقریب کے لئے بہانہ کی کیا کمی۔ پہلے میاں امجد کے ختنوں کی شادی کر دو۔ پھر نعیمہ کی بسم اللہ کر ڈالو۔ لو یہ دو تو میں نے بتا دیئے۔ تم کرنے پر آجاؤ اور حامی بھرو تو بیس اور بتا دوں۔

خانصاحب :۔ میں اِن فضول باتوں میں روپیہ برباد کرنا نہیں چاہتا اور نہ اِن بیہودہ رسومات کو کاج سمجھتا ہوں۔ میں تو کاج اِسے سمجھتا ہوں کہ امجد میاں کو ایم اے تک تعلیم دِلوا کر یا ولایت بھیجوں یا یہیں کسی اچھے عہدہ پر مامور کرا دوں۔ پھر اُن کی شادی کسی اچھے شریف اور معزز خاندان کی خوبصورت، تعلیم یافتہ، سُگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی سے کر دوں اور اُن کی دُنیا کو جنت بنا دوں۔ اِسی طرح اپنی نعیمہ کو خاصی تعلیم دلا کر اُس کا بھی اچھی جگہ بیاہ کر دوں۔

بیوی۔ یہ تو تم نے میرے دل کی باتیں کہیں۔ اے اللہ مجھے میرے امجد میاں کا سہرا دکھائیو۔

یہ کہکر رونے لگیں۔ خانصاحب بھی آبدیدہ ہو گئے۔ خانصاحب کے کوئی دوست باہر آئے۔ نوکر نے آواز دی۔ وہ اُٹھکر مردانے میں چلے گئے۔ بات گئی گذری

ہوئی۔ مگر تریا ہٹ مشہور ہے۔ بیوی صاحبہ نے دو چار دن کے بعد پھر شگوفہ چھوڑا اور اپنے میاں امجد کے ختنوں کی شادی کا اقرار لے کر ہی رہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں خانصاحب ایک مہینے کی رخصت لیکر دہلی آئے۔

خیر وہ شادی وادی جو کچھ ہونے والی تھی ہو ہوا چکی۔ ایک دن سہ پہر کو خانصاحب ہندوراؤ کے باڑے سے (دہلی کے ایک بازار کا نام ہے) گذر رہے تھے کہ اُن کی نظر ایک بساطی پر پڑی جو بیچارا اپنی چھوٹی سی دُکان لئے بیٹھا تھا۔ اُنہوں نے اُسے دیکھا اور اُس نے اُنہیں۔ دونوں تھوڑی دیر تک دم بخود ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر خاں صاحب نے ذرا دو قدم آگے بڑھکر کہا۔

خانصاحب:۔ ٹھاکر رام سنگھ۔

بساطی:۔ رام سنگھ مر گیا۔

خانصاحب تمہارا نام کیا ہے؟

بساطی:۔ ہدایت اللہ

خانصاحب:۔ غلط کہتے ہو میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تمہارا مڑا ہوا کان بتا رہا ہے کہ تم رام سنگھ ہو۔

بساطی:۔ آپ ذرا تشریف رکھئے۔ غل مچانے سے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے

میری کہانی سن لیجئے۔ پھر آپ کو اختیار ہے۔ چاہے پولیس کے سپرد کر دیں یا چھوڑ دیں۔ لیجئے آپ کو تکلیف ہوگی میں دکان بند کئے دیتا ہوں دکان بند کر کے) چلئے غریب خانہ پر تشریف لے چلئے۔ ڈریئے نہیں۔ میں مسلمان ہوں مسلمان مسلمان کو دھوکہ نہیں دیتا۔

اپنے گھر پہنچ کر اس مسلمان بساطی نے اپنی داستان یوں کہنی شروع کی بساطی "خانصاحب! آپ نے میرے ساتھ ظاہری طور پر دشمنی کی مگر حقیقت میں میرے ساتھ بہت بڑا سلوک کیا۔ آپ کی اس دشمنی کی بدولت میں نے وہ چیز پالی جس کی شکایت میں نے للتا سے کی تھی کہ مجھے میسر نہیں یعنی سکھ، اطمینان قلب، صراطِ مستقیم۔ سچ ہے

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

میری اور میرے ساتھیوں کی گرفتاری سے آپ کو خطابات ملے، انعامات ملے تمغہ جات ملے اور ہمیں اسیری۔ میرے ساتھیوں کا نہ معلوم کیا حشر ہوا۔ میں تو دوران مقدمہ ہی میں ساگر جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ دن کو کسی غار میں پڑا رہتا اور رات کو چلتا جنگل کی گھاس پات اور بیر وغیرہ میری خوراک تھے۔ چمگادڑوں کی طرح میری زندگی بسر ہو رہی تھی۔ اسی طرح ایک دن جو ایک غار میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں

کہ ایک مسلمان فقیر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر میرا دل اُن کی طرف کھنچنے لگا۔ یہ معلوم ہوا کہ گویا ایک برقی قوت ہے جو اپنی طرف کھینچ رہی ہے میں آدھے گھنٹہ تک اِسی طرح دم بخود کھڑا رہا۔ اِس کے بعد اُس فقیر روشن ضمیر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا جب فقیر صاحب عبادت سے فارغ ہوئے تو مجھ سے میرا حال پوچھنے لگے۔ میں نے سارا حال اول سے آخر تک بے کم وکاست بیان کر دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے میں نے اُن سے وہی کہا جو آپ سے اُس وقت کہا تھا جب آپ ملتا بنے ہوئے تھے یعنی یہ کہ سکھ کی تلاش ہے۔ اطمینانِ قلب میسر ہو جائے فقیر صاحب نے کہا "بچہ فکر نہ کر مل جائے گا کچھ روز ہمارے پاس رہو" میں اُن کے ساتھ چار مہینے تک رہا۔ اُنہوں نے مجھے دینِ اسلام کی تلقین کی۔ میرا نام ہدایت اللہ رکھا۔ مجھے نماز پڑھنی سکھائی۔ اُردو تو میں جانتا ہی تھا عربی بھی بغیر معنی سمجھے پڑھنے لگا۔ کچھ سورتیں قرآن شریف کی پڑھ پڑھ کر حفظ کر لیں۔ شاہ صاحب نے ڈاڑھی رکھنے کی بڑی تاکید کی اور کہا کہ یہ اللہ کا نور ہے اسے نہ منڈانا میں چار مہینے تک شاہ صاحب کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتا رہا

ایک دِن شاہ صاحب نے مجھے پانچسو روپے دیکر کہا "جاؤ وہ سامنے گوالیار ہے وہاں چلے جاؤ اور سب سے پہلے جو رنڈی کا کوٹھا ملے اُس پر چلے جانا اور رنڈی کے ہاں رات بھر رہنا۔ مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا۔ میں منہ سے تو کچھ بول نہ سکا مگر دم بخود کھڑا رہا۔ شاہ صاحب نے اِسی بات کو دُہرایا اور ایکبار زور دے کر کہا۔ مجبوراً میں وہاں سے یہ کہکر چلا کہ

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

گوالیار پہنچکر حسب فرمائش اپنے ہادی کے مَیں پہلے ہی کوٹھے پر چڑھ گیا۔ میں آپ سے بیان کر چکا ہوں کہ والد صاحب کی وفات کے بعد میں نے سارے کرم کئے۔ کوئی عیب باقی نہ چھوڑا۔ بیسیوں دفعہ طوائف کے کمروں کوٹھوں پر گیا سینکڑوں دفعہ اُن کو اپنے گھر پر بلایا۔ مگر اُس روز میرا منہ سِل گیا، زبان میں قفل لگ گیا۔ بڑی بی نے حسب معمول خوشامد کی باتیں کرنی شروع کیں مگر میں اپنی زبان سے نہ کہہ سکا کہ کیوں آیا ہوں۔ خیر میں مختصر کر کے کہتا ہوں کہ رات کو میں کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک عورت نہایت حسین اور کم عمر میرے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے ہاتھ

پکڑ کر پلنگ پر بٹھانا چاہا تو دیکھا کہ دھاروں رو رہی ہے۔ میرے بہت اصرار کرنے پر اُس نے فقط اتنا کہا کہ مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ مجھے یہ سُن کر بہت تعجب ہوا کہ ایک رنڈی جس کا پیشہ ہی عصمت فروشی ہو اور جس کی اُجرت یا عارضی قیمت یا تماش بینوں کی اصطلاح میں خرچی میں دے چکا تھا، ایسی بات کہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی اِس علیحدگی کی وجہ ظاہر کرے مگر وہ روتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ آخر میں نے کہا:۔

میں:۔ نیک بخت! تمہارے کہنے کے مطابق وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ تم فرش پر بیٹھ جاؤ۔ مگر مہربانی کر کے بتاؤ کہ رنڈی ہو کر یہ اجتناب کیسا اور تمہارا چاہا ہمیشہ ہو بھی جاتا ہے؟

عورت:۔ (روتی ہوئی) میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم کیجئے۔

میں:۔ آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہے؟

عورت:۔ للہ مجھ پر رحم کیجئے (ہاتھ جوڑ کر) خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ آپ مجھ دُکھیاری پر رحم کریں گے اللہ آپ پر رحم کریگا۔

یہ کلمات میرے کانوں کے ذریعہ قلب میں اُتر گئے اور پیوست ہو گئے۔

"اللہ مجھ پر رحم کریگا"۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیا مجھ جیسے سیہ کار، آوارہ، بدچلن،

بدمعاش، خونی، ڈاکو پر اللہ رحم کرے گا۔ اگر صرف دس روپے کے بدلے مجھے اللہ کا "رحم" مل جائے تو زہے نصیب میرے۔ اُس عورت کے اِن چند کلمات نے میرا دل ہلادیا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ مجھے ہی اُس کے رحم کی ضرورت تھی۔ میں مفرور قیدی تھا اور قیدی بھی معمولی نہیں۔ وہ قیدی جس کیلئے پھانسی تیار تھی جس کی تلاش میں پولیس سرگرداں تھی۔ میں نے بیتاب ہو کر کہا:۔

میں:۔ اے نیک عورت! خدا کے لئے اپنا حال صاف صاف بیان کر۔ تو یقیناً اس ناپاک پیشے سے تعلق نہیں رکھتی مگر یہ ظاہر ہے کہ تو رنڈی کے گھر میں ہے اور مثل طوائفوں کے تیری نائکہ بھی موجود ہے۔ پھر دریا میں رہ کر کپڑے تک نہ بھیگیں یہ کیسے ممکن ہے؟

عورت:۔ میں بیکس ہوں، مظلوم ہوں، بے یار و مددگار ہوں، عزیزوں سے بچھڑی ہوئی ہوں......

یہ کہکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی شریف گھرانے کی ہے۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ ناپاک خیالات سے بالکل پاک تھا اُس عورت کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کا حال سُننے کے لئے دل بیتاب تھا۔ تھوڑی دیر تک میں خیالات کے مد و جزر میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد میں

نے پوچھا:۔

میں:۔ مہربانی کر کے بتا دو کہ تم کون ہو اور یہاں کیونکر آئیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور اگر مجھ سے ہو سکے گا تو تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔

عورت:۔ میں شریف خاندان کی لڑکی ہوں۔ بدقسمتی سے یہاں آن پھنسی ہوں۔ آپ اگر میری مدد کرنی ہی چاہتے ہیں تو وعدہ کیجیے کہ جو کچھ میں کہوں گی وہ کر دیں گے

میں:۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔

عورت:۔ تو برائے مہربانی مجھے تھوڑا سا زہر لا دیجئے۔

میں:۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

عورت:۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ دو دن تک نہیں کھاؤں گی۔ تیسرے دن کھاؤں گی۔ اِس طرح آپ پر کسی قسم کا شبہہ نہیں ہو گا۔

میں:۔ آج سے پانچ مہینے پہلے یہ ممکن تھا مگر میں نے صدق دل سے توبہ کر لی ہے اب میں نے اللہ پاک کو تھوڑا سا پہچان لیا ہے اور اب ہرگز ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اِن باتوں میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میں تم سے بہ منت درخواست کرتا ہوں کہ اپنا حال بلا کم و کاست بغیر کسی شرم و حیا

کے مجھ سے بیان کردو۔

عورت:۔ خیر آپ اِس قدر اصرار کرتے ہیں تو سُنیئے۔ میں ..... شہر کی رہنے والی ہوں۔ حکیم .... کی بیٹی ہوں۔ ہائے میرے ماں باپ بھائی اور بہنوں کا کیا حال ہوگا۔

یہ کہکر پھر رونے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب ذرا طبیعت ہلکی ہوئی تو پھر کہنا شروع کیا۔

عورت:۔ ایک دن: ..... باغ میں ایک شخص کو دیکھکر شیطان نے بہکایا۔ ہونی شُدنی بات تھی ایک روز رات کو وہ مکان میں پچھواڑے کی طرف سے آیا۔ میری عقل پر پردے پڑ چکے تھے کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ میں اپنے زیور کا صندوقچہ لیکر نکل کھڑی ہوئی۔ اُس نے مجھے بہتیرے سبز باغ دکھائے تھے۔ کہتا تھا کہ شادی کا پیغام دینے سے حکیم صاحب ہرگز منظور نہ کریں گے اِس لیئے شادی کرنے کے بعد ہم اپنا قصور معاف کروالیں گے اور اُنہیں معاف کرتے ہی بن پڑے گی۔ کچھ دِنوں کی بات ہے۔ پھر سب ایک ہوجائیں گے۔ میں فلاں خاندان کا ہوں، اور فلاں جگہ تحصیلدار ہوں۔ انشاء اللہ تمہارے والد صاحب اور دیگر اعزاؔ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔ غرض مختصر یہ ہے کہ میں اُس کے ساتھ نکل آئی۔

اُس نے یہاں لاکر مجھے چھوڑ دیا اور خود زیور لے کر کہیں روپوش ہو گیا۔ راستہ میں یہ بُڑھیا مل گئی اور بہلا پھسلا کر مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ آج چوبیس دن سے میں اِس کے پاس ہوں۔

میں:۔ تو اس بدمعاش نے تمہاری عزت بھی لی اور زیور بھی؟

عورت:۔ اللہ کا شکر ہے کہ عزت تو اب تک بچی ہوئی ہے۔

میں:۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اول تو اُس بدمعاش ہی نے آبرو لے لی ہوگی۔ علاوہ اِس کے تم یہاں بھی تو چوبیس دن سے ہو۔

عورت:۔ اُس سے تو یوں عزت بچی کہ جب کبھی اُس نے بُرا ارادہ کیا، میں نے اُس کا وعدہ یاد دِلا کر کہا کہ اب تو میں تمہاری ہی ہوں حسب وعدہ نکاح کر لو۔ اور اس کے علاوہ اِتنا وقت ہی نہیں ملا کہ ہم دونوں مِل کر بیٹھتے کیونکہ مکان سے سیدھے اسٹیشن گئے اور ریل سے اُتر کر اُس نے چھوڑ ہی دیا ہاں اس جگہ آکر مجھے دقّت پڑی۔ اِس عرصے میں پانچ آدمی آئے مگر اللہ کی قدرت سے میرے رونے دھونے کی وجہ سے ہر دفعہ میری آبرو بچ گئی اللہ کا شکر ہے کہ میں اِس وقت تک عفیفہ اور کنواری ہوں۔

مجھے اس کا حال سن کر بہت افسوس ہوا اور دل پر چوٹ لگی۔ خیر میں اپنے

خیالات میں محو پلنگ پر سو گیا۔ رات کو میں نے خواب میں اُن ہی فقیر روشن ضمیر کو دیکھا کہ فرماتے ہیں ؎

بہ مے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزل ہا

یہ عورت تیرے لئے ہے اور تو اس کے لیئے۔ دیکھ خبردار اِسے نہ چھوڑیو۔ شرع شریف کے مطابق اِس سے نکاح کر یہی تیرے لئے ذریعۂ نجات ہے۔

میں نے صبح اُٹھتے ہی بڑی بی کو تیس روپے دیئے اور کہا کہ تین دن تک اِس عورت کو کسی اور سے نہ ملنے دینا میں روز آیا کرونگا اور اگر نہ آؤں تو تمہیں خرچی دے رہا ہوں کسی اور کو نہ آنے دینا۔ یہ کہکر میں اسٹیشن گیا اور ریل میں بیٹھکر اُس شہر میں پہنچا جہاں حکیم صاحب رہتے تھے۔ میں سیدھا اُن کے مکان پر گیا۔ اطلاع کروائی۔ حکیم صاحب باہر تشریف لائے۔ بڑی نورانی شکل کے آدمی تھے مجھے دیوان خانے میں لیجا کر بٹھایا اور پوچھنے لگے آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اُن کی لڑکی کا قصّہ جہاں تک ہو سکا ایسے الفاظ اور ایسے پیرایہ میں بیان کیا کہ اُن کو غصّہ نہ آئے مگر وہ سُنتے ہی جھلا اُٹھے۔ منہ سرخ ہو گیا اور بولے:۔

حکیم صاحب:۔ اُس ناشُدنی کا نام میرے سامنے نہ لو۔ خدائے پاک کی قسم کئی دفعہ

خودکشی کا خیال آچکا ہے مگر یہ سوچتا ہوں کہ اُس ننگِ خاندان نے دُنیا تو میرے لئے دوزخ بنا ہی رکھی ہے حرام موت مر کر سیدھا جہنم میں جاؤں گا۔

میں :۔ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ ہونی شُدنی امر تھا کہ وہ غریب اُس بدمعاش کی باتوں میں آگئی مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ابتک باعصمت ہے آپ .....

حکیم صاحب :۔ (بات کاٹ کر) تم بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ رنڈی کے گھر میں رہکر کسی کی عصمت قائم رہ سکتی ہے۔

میں :۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ اگر یقین نہ ہوتا تو اُس سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اب وہ آپ کے گھر میں پہلے کی طرح نہیں رہ سکتی۔ کُنبے خاندان کی عورتیں اُسے گود گود کر مار ڈالیں گی میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اُس کا قصور معاف کر دیں اور چُپ چاپ اپنے مکان میں اُس کا نکاح میرے ساتھ کر کے میرے سپرد کر دیں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جہاں تک ہو سکے گا اُس کی دل جوئی کر کے اِس نہ بھلنے والے واقعہ کو اُس کے دل سے فراموش کرنے کی کوشش کروں گا۔

حکیم صاحب :۔ میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ اُس کی شکل دیکھکر میری آنکھوں میں خون اُتر آئے گا۔ علاوہ اس کے میں اِس مکان میں اُسے ہرگز نہیں بلا سکتا

میں:۔ تو آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ تشریف لے چلیے۔ فقط آدھے گھنٹے کی بات ہے۔ میں سب انتظام کر رکھوں گا۔ بس اتنی عرض ہے کہ آپ اپنی موجودگی میں اُس کا نکاح کر دیں۔

غرض بڑی منت خوشامد سے میں نے حکیم صاحب کو راضی کر لیا اور اپنے ساتھ گوالیار لایا۔ وہاں ایک مکان میں اُن کو ٹھیرایا۔ پھر اُس رنڈی کے ہاں جا کر اُس لڑکی کو اپنے ساتھ لایا اور اُسے باپ کے قدموں پر گرا دیا۔ وہ سماں بیان نہیں کر سکتا۔ خیال ہی کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ باپ بیٹی دونوں خاموش تھے۔ آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ لڑکی باپ کے قدموں سے آنکھیں مل رہی تھی۔ میری بے انتہا منت سماجت اور لڑکی کے ہاتھ جوڑ کر رو رو کر معافی مانگنے سے بارے تھوڑی دیر میں حکیم صاحب کے دل میں محبتِ پدری نے جوش مارا اور "ہائے قسمت کے لکھے کی کسے خبر تھی"۔ کہہ کر بیٹی سے لپٹ گئے پیار کیا سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے:۔

حکیم صاحب:۔ میں نے تیرا قصور تو معاف کر دیا مگر یاد رکھ میرے گھر میں کبھی بھول کر قدم نہ رکھیو۔ تو میری طرف سے اور سارے خاندان کی طرف سے مر گئی۔

مختصر یہ ہے کہ حکیم صاحب اور دو آدمیوں کی موجودگی میں میرا اُس کے ساتھ نکاح ہو گیا
ـس کے بعد میں اپنی بیوی کو لے کر دہلی چلا آیا۔ شاہ صاحب کے روپیوں میں
ـ ساڑھے تین سو روپے اب بھی میرے پاس تھے۔ کچھ گھر کے خرچ کے لئے
ـکر باقی کا دکان کا سامان خریدا اور اللہ پاک کی ذات پر بھروسہ کر کے اپنی چھوٹی سی
ـ سے کاروبار شروع کر دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ خاصی اچھی طرح گذر ہو رہی ہے
ـحلال کی روزی کماتا ہوں۔ مسجد میں پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا
ـ عبادت میں دل لگتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل پر سے آہستہ آہستہ
ـتر رہا ہے۔ اِدھر بیوی کو دیکھتا ہوں تو بالکل فرشتہ، باعصمت، خدمتگذار
ـر شعار۔ اللہ پاک کا ہر وقت شکر کرتا ہوں کہ اُس نے اپنی رحمت سے مجھے
ـسکھ اور اطمینانِ قلب دے دیا جس کی مجھے ہر وقت تمنا اور آرزو تھی۔ یہ سب
ـہے مگر میں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کر سکتا کہ مجھے اطمینانِ قلب آپ کی بدولت
ـب ہوا ہے۔ آپ للتا بن کر ہم سب کو پکڑتے نہیں سیہ کاری کی زندگی سے
ـئیے میری بیوی اور دونوں معصوم بچوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ یہ کہکر خانصاحب
ـپکڑ کر اندر لے گئے اور بیوی سے بولے:-

ـ اللہ: یہ میرے وہی کرم فرما خانصاحب ہیں جن کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں

اِس عورت نے بڑے ادب سے خانصاحب کو سلام کیا۔ خانصاحب کے دل پر اِس داستانِ عبرت کا کچھ ایسا اثر ہوا اور فرشتہ صفت عورت کی شکل دیکھ کر قلب کی یہ حالت ہوئی کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور عورت کے سر پر ہاتھ پھیر کر بھرائی ہوئی آواز میں بولے:۔

خانصاحب:۔ قسمت نے تمہیں اپنے ماں باپ بھائی بہن اور دیگر عزیزوں سے چھڑا دیا مگر اللہ پاک رحیم و کریم ہے اُس نے آج سے تمہیں اِس کا نعم البدل عطا کر دیا ہے۔ آج سے تم میری بیٹی ہو میرے بچے تمہارے بھائی بہن ہیں اور میری بیوی تمہاری ماں۔ پھر ہدایت اللہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

خانصاحب:۔ تم کفر کی ظلمت میں پیدا ہوئے۔ اُسی فضا میں پلے جوان ہوئے بدترین گناہوں کے مرتکب ہوئے مگر تائید ایزدی تمہارے شاملِ حال ہوئی تمہیں کفر کی ظلمت سے نکال کر اسلام کی شمع نورانی کے اُجالے میں لا کھڑا کیا۔ سچ ہے یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اور جب اللہ پاک نے تمہیں ہدایت دی تو پھر گمراہ کرنیوالا کون؟ تم بےفکری کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کرو۔ اول تو یہاں تمہیں کوئی پہچان نہیں سکتا دوسرے ممالک متوسط کا فاصلہ بہت ہے تیسرے بہت کم لوگوں نے تمہیں دیکھا ہے اور اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہوا بھی تو یقین جانو میں اپنی انتہائی قوت صرف کر دوں گا اور تمہیں معافی دلوا کر رہوں گا۔ گورنمنٹ پر میرے بہت حقوق ہیں۔

جب کبھی ثابت بالم بھی ساحل کی تمنا ہوتی

اب کشتی الٹی شکستہ بہ ساحل کی تمنا کس کو تھی

عصمت چغتائی

ساجن ساجن پکاروں گلیوں میں

کبھی ڈھونڈوں کبھی گلیوں میں

Ahmad

کہانی ہماری حقیقت نہ ہوگی

ہمیں کاش تم سے محبت نہ ہوتی

یارب اللہ السیما مولانا

Bashir Ahmad

Bashir Ahmed Rather

نیلم کی انگوٹھی

Neelam

نیلم کی انگوٹھی

ظریف لکھنوی کی بہترین پیشکش

پیشکش

Neelam ki

نیلم کی انگوٹھی

عمارہ کھانڈے (ثرال)

ایم اے اردو

You see what

R with confidence (R)

Hosto eyeline 500

Humans